9

سندھ کا زرعی نظام اور ہاری جدوجہد

پختونخواہ کا قومی مسئلہ۔ ایک مختصر جائزہ

پاکستان اکیسویں صدی کی دہلیز پر

تقسیم ہند اور قیام پاکستان۔ ایک تبصرہ

فلسفہ

سیاسی معاشیات

تاریخ

سوشیالوجی

نفسیات

ادب

سیاسیات

مجموعہ نمبر ۹

ریسرچ فورم پبلی کیشنز

پوسٹ آفس بکس ۳۵۱۱

کراچی نمبر ۵

ریسرچ فورم میں شائع ہونے والے مضامین کے مندرجات سے ادارے کا متفق ہونا ضروری نہیں ہے۔

تبصرے کے لیے کتاب کی دو جلدوں کا آنا ضروری ہے۔

ناشر: ریسرچ فورم پبلی کیشنز۔ کراچی
تقسیم کار: مکتبہ دانیال، وکٹوریہ چیمبرز۔۲ عبداللہ ہارون روڈ کراچی
مطبع: احمد برادرس پریس کراچی
طبع اول: اکتوبر ۱۹۸۹ء
قیمت: ۲۵ روپیہ

فہرست

پیش لفظ

ہماری کارکردگی

خود احتسابی کا عمل سماجی جدوجہد کا لازمی و ناگزیر جزو ہوتا ہے۔ چنانچہ وہ تنظیمیں، ادارے اور تحریکیں جو معاشرہ سازی کی جدوجہد میں مصروف ہوتی ہیں، خود احتسابی کو ایک مستقل عمل کے طور پر برتنے کی کوشش کرتی ہیں، اپنی خامیوں پر نظر رکھتی ہیں اور ان کی اصلاح کے راستے تلاش کرتی رہتی ہیں۔ علمی و نظریاتی کاوشیں بھی اس کلیے سے آزاد نہیں ہوتیں۔ یہ کاوشیں اور سرگرمیاں بھی اسی وقت بامعنی قرار پاتی ہیں جب وہ اپنے آدرشوں اور اہداف کے حوالے سے اپنی کارکردگی اور نتیجہ خیزی کا جائزہ مستقلاً اپنے پیش نظر رکھتی ہیں۔ ریسرچ فورم نے اب تک کے سفر میں کیا حاصل کیا اور کہاں کہاں ناکام رہا، آج ہم اسی حوالے سے اپنے قارئین سے مخاطب ہیں۔

ریسرچ فورم نے کوئی ساڑھے چار سال قبل اپنے سفر کا آغاز اس عزم اور اعلان کے ساتھ کیا تھا کہ ہم ملک کے طول و عرض میں جاری جہد حیات میں ایک ایسے پلیٹ فارم کو متعارف کرا رہے ہیں جو سماجی شعور کے فروغ میں معاون ثابت ہو سکے اور سماجی علوم کے حوالے سے ملک میں جاری نظریاتی مباحثے کی سطح کو بلند کر سکے۔ اس عزم کا اظہار کرتے وقت وہ مشکلات ہماری نظر سے اوجھل نہیں تھیں جو اس قسم کے جرائد یا کتابی سلسلوں کی راہ میں حائل ہوتی ہیں۔ ملک کی مجموعی طور پر پسماندہ علمی فضا بھی ہمارے پیش نظر تھی۔ ہمیں اس بات کا بھی احساس تھا کہ ہمارے وہ اہل قلم بھی جو سیاسی و نظریاتی موضوعات پر طویل عرصے سے لکھ رہے ہیں اور جنہوں نے یقیناً بہت کارآمد چیزیں بھی تخلیق کی ہیں، ٹھوس علمی و تحقیقی کاموں کی طرف یا تو مائل نہیں ہیں یا پھر ناموافق حالات کی وجہ سے اس بھاری پتھر کو محض چھو کر چھوڑ دیتے ہیں۔ سب

سے بڑھ کر یہ کہ ہمیں خود اپنی کم مائیگی کا شدید احساس تھا۔ نہ تو ہمیں وہ مالی وسائل میسر تھے جو اس قسم کے منصوبوں کے لیے ناگزیر ہوتے ہیں اور نہ ہی ہمیں خود اپنی علمی صلاحیتوں کے بارے میں کوئی خوش فہمی تھی۔ ان تمام حقائق کے خاطر خواہ احساس کے باوجود اگر ہم نے ریسرچ فورم کے اجراء کا فیصلہ کیا تو صرف اس وجہ سے کہ ہمارے خیال میں اس قسم کے جریدے یا کتابی سلسلے کی اشد ضرورت تھی جس میں نعرہ بازی اور صحافیانہ تحریروں کی سطح سے بلند ہو کر سنجیدہ علمی و تجزیاتی مطالعے پیش کیے جائیں۔ اس ضرورت کا احساس اس قدر قوی تھا کہ یہ ممکنہ موانعات و مشکلات کے احساس پر غالب آگیا اور ریسرچ فورم منصۂ شہود پر آگیا۔

آج اپنی گذشتہ کارکردگی کا جائزہ لیتے ہوئے ہم اپنے آپ کو سرخرو محسوس کرتے ہیں کہ ریسرچ فورم نے قارئین کی بڑی تعداد کو مایوس نہیں کیا ہے۔ فورم کی اشاعت ایسے زمانے میں شروع ہوئی تھی جب ملک میں آمریت کا دور دورہ تھا اور جمہوریت پسندوں پر عرصۂ حیات تنگ کر دیا گیا تھا۔ ہزاروں افراد زندانوں میں محبوس تھے؛ شہری حقوق معطل تھے، ملک پر شدید قسم کی مذہبی رجعت پسندی و دیوانگی مسلط تھی اور آزادی و مختاری کے حق میں اٹھنے والی ہر آواز پر اسلام دشمنی کے فتوے صادر کر دیئے جاتے تھے۔ ایسے ماحول میں ریسرچ فورم کا اجراء جرات مندانہ اقدام تھا جس کی سبھی ترقی پسند و روشن خیال حلقوں نے تعریف کی۔ فورم نے جلد ہی ایک ٹھوس نظریاتی کتابی سلسلے کی حیثیت سے اپنی شناخت قائم کروالی اور ہمارے قارئین کا حلقہ ملک کے دور افتادہ اضلاع تک پھیل گیا۔ فورم کو نظریاتی حلقوں میں جو قبولیت حاصل ہوئی اس کا اندازہ اس امر سے لگایا جا سکتا ہے کہ اس کے کئی شماروں کے ایڈیشن شائع ہوتے ہی ختم ہو گئے اور ہمیں ان کے نئے ایڈیشن شائع کر کے مانگ پوری کرنی پڑی۔

فورم نے گذشتہ چار ساڑھے چار برسوں میں پاکستانی ریاست، سماجی ساخت، عالمی سرمایہ دارانہ نظام کے ساتھ پاکستان کے تعلق کی نوعیت، مزدور طبقے کی تاریخ و جدوجہد، قومی سوال، زراعت کے شعبے، صحت، صحافت اور ادب، غرض مختلف موضوعات پر تحقیقی مقالے شائع کیے۔ مئی ۱۹۸۶ء میں یوم مئی کے حوالے سے خصوصی شمارہ شائع کیا گیا۔ اس کے علاوہ اگست ۱۹۸۷ء میں سبط حسن نمبر اور ۱۹۸۸ء میں قومی سوال پر خصوصی شمارہ شائع ہوا۔

ابتداء ہی سے ریسرچ فورم کے زیر اہتمام وقتاً فوقتاً علمی نشستیں اور سیمینار بھی منعقد کیے گئے۔ فورم کی علمی نشستیں، اپنی جگہ بحث و مباحثے کا ایک کارآمد پلیٹ فارم ثابت ہوئیں، ان محفلوں میں ہم نے بہت سے دانشوروں کو دعوت خطاب دی جن میں سبط حسن، حمزہ علوی، ڈاکٹر اقبال احمد، ڈاکٹر مبارک علی، ڈاکٹر محمود حسن خان، رسول بخش پلیجو، ڈاکٹر ظفر عارف، ڈاکٹر عارف حسن، ڈاکٹر فیروز احمد اور بہت سے دوسرے حضرات شامل تھے۔ ریسرچ فورم نے ۱۹۸۶

میں بعض دیگر تنظیموں کے ساتھ مل کر یوم مئی کے حوالے سے ایک سیمنار منعقد کیا، ۱۹۸۷ء میں قومی سوال پر ایک آل پاکستان سیمنار منعقد کیا گیا۔ فورم کی ان مجلسی و اشاعتی سرگرمیوں کا مقصد نظریاتی مباحثے کو مہمیز کرنا اور غور و فکر کے نئے گوشے اجاگر کرنا تھا۔ ہمیں خوشی ہے کہ ہم اس مقصد میں کامیاب رہے۔

ہماری کارکردگی کا گوشوارہ ہماری ناکامیوں کے تذکرے کے بغیر نامکمل رہے گا۔ اس لیے ہم چاہیں گے کہ اس موضوع پر بھی کھل کر گفتگو کی جائے۔ ہمارے قارئین اور احباب اکثر ہماری خامیوں کی نشاندہی کرتے رہے ہیں۔ اپنی بہت سی کوتاہیاں خود ہماری نظر سے بھی اوجھل نہیں رہی ہیں۔ ہمارے قارئین کو ایک بہت بڑی شکایت یہ ہے کہ فورم کی اشاعت عدم تسلسل کا شکار رہتی ہے۔ ہمیں بھی اس بات کا احساس ہے کہ ابتدا کے چند شماروں کے بعد فورم کی اشاعت میں خاصے بڑے وقفے حائل ہونے لگے۔ ۱۹۸۷ء میں ہم صرف ایک شمارہ شائع کر سکے۔ اسی طرح ۱۹۸۸ء میں بھی صرف ایک شمارہ منظر عام پر آ سکا۔ مختلف شماروں کے درمیان ان طویل وقفوں کی بہت سی وجوہات ہیں جن میں مالی وسائل کی کمی اور معیاری مقالوں کی عدم دستیابی بھی شامل ہیں۔ اس کے علاوہ بعض اوقات ہم اپنے اشاعتی کام اور علمی نشستوں اور سیمناروں کے انعقاد میں توازن نہ رکھ سکے۔ پھر خصوصی شماروں پر بھی ہمارا زیادہ زور رہا جو غیر ضروری تاخیر کا سبب بنا۔ بہر حال اسباب کچھ بھی ہوں، فورم کی اشاعت میں وقفوں کا در آنا کوئی اچھا تاثر قائم نہیں کر سکا اور اس کا ہمیں احساس ہے۔ آئندہ ہماری کوشش ہو گی کہ فورم کی اشاعت میں زیادہ باقاعدگی کا مظاہرہ کریں۔

ایک اور خامی جس کا قارئین کو گلہ ہے، یہ ہے کہ ہمارے فورم میں تراجم کافی تعداد میں شامل ہوتے ہیں جبکہ اوریجنل ریسرچ کا شعبہ کمزور ہے۔ جہاں تک تراجم کا تعلق ہے ہمارے خیال میں تراجم کی اشاعت بجائے خود کوئی غلط بات نہیں ہے۔ پاکستان کے حوالے سے اگر انگریزی یا دیگر غیر ملکی زبانوں میں معیاری تحقیقی مقالے شائع ہوتے ہیں تو ان کے ترجمے پاکستان کے اردو داں قارئین تک ضرور پہنچنے چاہئیں۔ البتہ اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ ہم اوریجنل ریسرچ سے پہلو تہی کریں۔ اگرچہ فورم میں نت نئے موضوعات پر نئی تحقیقات شائع ہوتی رہی ہیں تاہم ان کی تعداد میں اضافے کی ضرورت ہے۔ اس پہلو پر بھی ہماری نظر ہے کہ ہم بہت زیادہ لکھنے والوں کو متحرک نہیں کر سکے۔ اس سلسلے میں ہمیں بعض عملی مشکلات کا سامنا رہا ہے۔ مثلاً کسی بھی موضوع پر تحقیق کے لیے کچھ نہ کچھ مالی وسائل ضرور درکار ہوتے ہیں۔ فورم کے پاس ایسے وسائل نہ ہونے کی وجہ سے ہم اپنے قلمکاروں کی مالی معاونت نہیں کر پاتے اور انہیں اپنے طور پر اپنی تحقیق کا بار اٹھانا پڑتا ہے۔ بہر حال مستقبل میں ہماری کوشش رہے گی کہ زیادہ سے زیادہ

لکھنے والوں سے رابطہ کریں اور مربوط انداز میں فورم کے لیے تحقیقات کروائیں۔

ریسرچ فورم کے مضامین میں زبان و بیان کی غلطیاں بھی ہمارے قارئین کی تنقید کا ہدف بنی ہیں۔ تراجم میں بارہا گنجلک زبان کی شکایت کی گئی ہے۔ اگرچہ ہماری ہمیشہ کوشش رہی ہے کہ ہم فورم میں شامل مضامین کو زیادہ سے زیادہ عام فہم بنائیں مگر ابھی تک ہم اس میں مکمل طور پر کامیاب نہیں ہوسکے۔ امید ہے کہ آئندہ قارئین کو فورم میں اس حوالے سے بہتر تبدیلیاں نظر آئیں گی۔

ملک میں جمہوریت کی بحالی کے بعد ہمیں توقع تھی کہ اب نسبتاً بہتر حالات میں ملک میں علمی و تہذیبی سرگرمیوں کا دائرہ وسیع ہوگا اور سنجیدہ تحریروں کی اشاعت میں اضافہ ہوگا۔ ہمیں یہ بھی توقع تھی کہ خود فورم کو بدلے ہوئے حالات میں نئے لکھنے والوں کا تعاون حاصل ہوگا۔ افسوس کہ اس ضمن میں ہماری توقعات پوری نہیں ہوئیں۔ بد قسمتی سے طویل آمریتوں نے ملک کے سیاسی کلچر کو بے حد پست بنا دیا ہے۔ ہماری تہذیبی زندگی بھی مسخ ہو کر رہ گئی ہے اس کا اثر خود ملک کی سیاسی جماعتوں اور نظریاتی تنظیموں کے فکری و عملی معیارات پر بھی پڑا ہے۔ صحافت پر ہر چند کہ ماضی کی پابندیاں ختم ہو چکی ہیں مگر اس کے معیار میں ابھی تک کوئی قابل محسوس بلندی نہیں آئی ہے۔ ویسے تو ان دنوں اخبارات و رسائل کا ایک سیلاب امنڈ آیا ہے مگر ان میں کتنے پرچے ہیں جو معیاری قرار دیئے جاسکتے ہیں۔ ہمارے خیال میں یہ سب مظاہر اس مجموعی معاشرتی تنزلی اور بگاڑ ENERATION کے عکاس ہیں جو برسوں کے آمرانہ تسلط کا نتیجہ ہے۔ البتہ ہمیں امید ہے کہ اگر ملک میں جمہوریت کو استقرار حاصل رہا اور وہ پختہ تر ہوتی رہی تو وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ معاشرتی سطح پر بہتر تبدیلیوں کا راستہ کھل جائے گا۔ اس ضمن میں ہم ریسرچ فورم کے ذریعے اپنے حصے کا کام سرانجام دیتے رہیں گے۔

آخر میں ہم قارئین سے اپیل کریں گے کہ وہ ماضی کی طرح آئندہ بھی اپنے مشوروں سے نوازتے رہیں اور اپنی تنقیدی آراء سے آگاہ رکھیں۔ ہم ترقی پسند اہل قلم، اساتذہ، سیاسی تنظیموں سے وابستہ دانشوروں اور ریسرچ اسکالرز سے بھی توقع رکھتے ہیں کہ وہ ریسرچ فورم کو اپنے معروضی تجزیے بھیجتے رہیں گے۔

ادارہ

سندھ کا زرعی نظام اور ہاری جدوجہد:
پس منظر و پیش منظر

سجّن بھٹو

مادر وطن سندھ صدیوں سے سرسبز خطہ رہا ہے۔ سندھ کی فصلیں، دولت، بیوپار ہی وہ سبب رہے ہیں جنھوں نے بار بار غیر سندھی حملہ آوروں کو سندھ پر حملہ کرنے کے لئے اکسایا ہے، سندھ کو لوٹا اور تاراج کیا گیا ہے۔ سندھیوں نے ہر حملہ آور کے ساتھ اپنی دھرتی، بیوپار، عزت، عظمت اور زمین کی حفاظت اور آزادی کے لئے بہادری اور غیرت مندی کے ساتھ جنگیں لڑی ہیں اور یہ واقعات سندھ کی تاریخ کے لازوال واقعات ہیں۔ سندھ میں شروعاتی زراعتی نظام، قبائلی زراعتی نظام رہا ہے۔ اور یہاں کی کاشت کا دارومدار برسات پر ہوتا تھا یا کنواں کھود کر کاشت کی جاتی تھی اور کاشت کا نظام مشترکہ ہوتا تھا۔ کلہوڑوں کے دور میں پہلی بار نہریں کھود کر دریا کے پانی پر کاشت کرنے کی ابتدا کی گئی اور دیہاتی معاشرتی سرشتہ مضبوط بنیادوں پر ترقی کرنے لگا۔ مگر ٹالپر حکمرانوں نے اس نظام کو مزید بہتر بنانے کی بجائے سابقہ ترقی کو روک دیا اور ہزاروں ایکڑوں پر شکار گاہیں بنادی گئیں۔ کلہوڑوں کی حکومت جو کہ دراصل مغل فرمانرواؤں کے تابع تھی اور ان کو محصول ادا کرتی تھی۔ اس نے کچھ زمین اپنے خاص آدمیوں میں تقسیم کی تھی جن کو اوائلی قسم کی جاگیریں کہا جاسکتا ہے مگر ان جاگیروں میں زمین کا مالک کسان ہوا کرتا تھا۔ اور اپنی فصل میں سے ایک مقررہ جنس کی صورت میں لگان کے طور پر ان زمینداروں کو دیتا تھا۔ مگر مغلوں کے بڑھتے ہوئے تاوان کی رقم پوری کرنے کے لئے کسانوں پر بھاری ٹیکس لگائے گئے، جس کے نتیجے میں صوفی شاہ عنایت شہید کی تحریک ۱۷۱۸ء میں "جو بوئے سو کھائے" کے نعرے کی شکل میں تیزی سے پھیلنے لگی، حاکموں کے نظام، بھاری ٹیکسوں میں مسلسل اضافے

اور غلط زمینداری نظام نے ہزاروں کسان خاندانوں کو تحریک کے مرکز جھوک شریف میں جمع کر دیا۔ اس اجتماع اور تحریک نے کلہوڑا حکمرانوں کے ہاتھ مغل حاکموں کی بھی نیند حرام کر دی اور انہیں اپنا اقتدار خطرے میں محسوس ہونے لگا۔ اس لئے حاکموں کے لشکر نے شاہ عنایت شہید کے معتقدوں کے اوپر حملہ کیا مگر وہ انہیں میدان جنگ میں شکست نہ دے سکے تو انہوں نے منافقت سے کام لیتے ہوئے صلح کے بہانے شاہ عنایت کو دربار میں بلوایا اور انہیں دربار میں شہید کر دیا۔ مگر بعد میں بھی تحریک مسلح جنگ کی صورت میں جاری رہی۔ کلہوڑوں کی طرف سے نہریں کھود کر کاشت کرانا حقیقت میں ترقی پسند اور تاریخ کو ارتقا کی طرف لے جانے والا عمل تھا مگر شاہ عنایت شہید کی تحریک کو طاقت کے زور پر کچلنے والا عمل تاریخ کے ارتقا کے آگے بند باندھنے کی کوشش تھی۔ صوفی شہید کی تحریک حالانکہ صوفی ازم کی نظریاتی اساس پر یقین رکھتی تھی مگر اسکے باوجود وہ اپنے دور کی ترقی پسند تحریک تھی جس نے کسانوں کو منظم کیا اور جدوجہد کے لئے تیار کیا۔ ٹالپروں سے انگریزوں نے طاقت اور اپنوں کی غداری کی وجہ سے حکومت چھین لی اور سندھ سارے ہندوستان کی طرح ۱۸۴۳ء میں انگریزوں نے مفتوح علاقوں میں شامل کر لیا۔ انگریز کا سندھ پر قبضہ کرنے کا مقصد بھی سابقہ حملہ آوروں کی طرح سندھ کی دولت، زراعت اور معدنیات کو لوٹنا ہی تھا۔

انگریزوں کا زرعی نظام

انگریزوں نے اپنی لوٹ مار سے زیادہ سے زیادہ نفع حاصل کرنے کے لئے سندھ کے زرعی نظام میں بہت سی مقداری تبدیلیاں کیں جس کی وجہ سے زرعی نظام کی کیفیت ہی تبدیل ہو گئی۔

۱۔ انگریزوں نے غدار سندھیوں کو، جنہوں نے سندھ فتح کرنے کے وقت انکا ساتھ دیا تھا، جاگیریں عطا کیں جو کہ لاکھوں ایکڑ رقبے پر پھیلی ہوئی تھیں۔ اس طرح جاگیرداری رشتے کی ابتدا ہوئی۔ زمین کا مالک جاگیردار بن گیا۔ کسان اور جاگیردار کے رشتے نے جنم لیا اور جاگیرداری ظلم نے اپنے نظارے دکھانے شروع کر دیئے۔

۲۔ سندھ دریا پر سکھر بیراج تعمیر کیا گیا اور چھ بڑی نہریں کھود کر لاکھوں ایکڑ رقبے کو آباد کیا گیا اور اس کے لئے آب پاشی کی جدید سہولتیں فراہم کیں جس سے زرعی نظام اور زرعی پیداوار میں بڑی تبدیلی رونما ہوئی۔

۳۔ زرعی پیداوار سے زیادہ سے زیادہ فائدہ حاصل کرنے کے لئے انگریزوں نے ریوینیو

REVENUE کھاتے کی بنیاد ڈالی۔ زمین کا ریکارڈ اندراج ہونے لگا۔ زمین کی سرکاری اور غیر سرکاری بنیادوں پر تقسیم اور الاٹمنٹ ہونے لگی۔ تپیدار، پٹواری، مختیار کار، مقدمہ، ڈپٹی کمشنر وغیرہ جیسے بااختیار آفیسر صاحبان اور پولیس قائم کر کے افسر شاہی کا ایک ایسا فرمانبردار گروہ پیدا کیا جو اپنے اپنے علاقے کے سیاہ و سفید کا مالک تھا اور لگان کی وصولی اب جنس کی بجائے سکہ رائج الوقت کے تحت ہونے لگی۔

۴۔ سندھ کے دور دراز علاقوں کی پیداوار اور برطانوی صنعت کے لئے خام مال کی بندرگاہ تک آسان ترسیل اور باغیوں کو کچلنے کے لئے دور دراز علاقوں تک وفادار فوج پہنچانے کے لئے ریلوے لائین بچھائی گئی۔

۵۔ انگریزوں نے حُروں کی بغاوت کو کچلنے کے لئے پنجابی اور گرکھا فوج کو بہت بڑی تعداد میں استعمال کیا۔ جنہوں نے حُروں کی پناہ گاہ مکھی جنگل کو آگ لگا کر جلا دیا جس کی وجہ سے ہزاروں مردوں کے ساتھ انکی عورتیں بچے بھی جل کر خاکستر ہوگئے۔ مکھی جنگلات کی پانچ لاکھ ایکڑ زمین انگریزوں نے ان پنجابی فوجیوں اور کچھ انگریز آفیسروں کو تحفے میں الاٹ کر دی۔ یوں ۱۹۰۱ء میں پہلی بار انگریزوں ہی نے سندھ کی زمین غیر سندھیوں کو الاٹ کرنے کی ابتدا کی اور سندھ کے اندر پنجابیوں کے چک قائم ہونے لگے۔ انگریز سرکار کے مندرجہ بالا اقدامات اٹھانے سے سندھ کے زرعی نظام میں نئے تضاد پیدا ہوگئے جو یہ تھے۔

(الف) جاگیردار اور کسان کا تضاد، اس نے وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ شدت اختیار کر لی۔ کیونکہ جاگیردار کسانوں پر بے انتہا ظلم کر رہے تھے، کسانوں کی عزت، ملکیت اور محنت کے مالک بن گئے تھے یہ تضاد طبقاتی تضاد بن گیا۔

(ب) افسر شاہی کا کسانوں اور چھوٹے تھانیداروں سے تضاد، ریوینیو کھاتے کے قیام، کھاتے کی لوٹ مار، کھاتے کے آفیسروں کی لوٹ مار، لگان کی بھاری وصولی اور اس میں اضافہ اور پولیس کی ظالمانہ روش کی وجہ سے پیدا ہوا۔

(ج) سکھر بیراج پر آباد ہونے والی زمین کا الاٹمنٹ کا تضاد، بیراج کی کمانڈ ایریا میں آنے والی زمین زمینداروں کو الاٹ کی جانے لگیں جس کے خلاف کسانوں نے احتجاج کیا اور اپنے لئے الاٹمنٹ کا حق طلب کیا جس سے ایک نئے تضاد نے جنم لیا۔

(د) غیر سندھیوں (پنجابیوں) کو مکھی جنگلات کی زمین دینے اور انکو مستقل بنیادوں پر آباد ہونے کے لئے جواز پیدا ہونے سے سندھی اور غیر سندھی تضاد نے بھی جنم لیا۔

ان تضادات کی وجہ سے کچھ انسانیت دوست اور سماج سیوک (سدھار) قسم کے لوگوں کے دلوں میں کسانوں کی حالت زار بہتر بنانے کا جذبہ پیدا ہوا اور انہوں نے ۱۹۳۰ء میں "سندھ ہاری

کمیٹی" کی بنیاد ڈالی۔ بنیاد ڈالنے والوں میں جی۔ ایم۔ سید، عبدالقادر ایم خان، جیٹھمل پرسرام، جمشید مہتا، قادر بخش نظامانی، نور محمد پلیجو اور دیگر شامل تھے۔ سب سے پہلے ۱۹۳۶ء کے بعد انہوں نے سکھر بیراج کی کمانڈ ایریا میں ہونے والی الاٹمنٹ کے تضاد کو اپنے ہاتھ میں لیا اور غریب کسانوں کو زمین الاٹ کرانے کی کوشش کی گئی جس کے نتیجے میں ڈیڑھ لاکھ ایکڑ رقبہ زمین کسانوں کو الاٹ ہوئی۔ الاٹمنٹ کی مزید سہولت سے کسانوں کو فائدہ اٹھانے سے روکنے کے لئے ایوب کھوڑو اور مسٹر عبدالغفور ڈنے قانونی پیچیدگیاں پیدا کیں اور سہولت کسانوں کے لئے مشکل تر بنادی جس پر قادر بخش نظامی اور نور محمد پلیجو نے ہاری جدوجہد کو طبقاتی جدوجہد کا رخ دے دیا اور جاگیرداری اور افسر شاہی مظالم کے خلاف جدوجہد شروع کر دی تو جی۔ ایم۔ سید اور کچھ دیگر اختلاف رکھ کر ہاری کمیٹی سے علیحدہ ہوگئے اور یوں انہوں نے اپنے طبقے سے وفاداری نبھائی۔

۱۹۳۷ء سے ۱۹۵۰ء تک سندھ ہاری کمیٹی نے کسانوں کے طبقاتی تضاد کو بنیاد بنایا اور ٹریڈ یونین بنیاد پر جاگیرداری مظالم کے خلاف جدوجہد کی۔ ۱۹۴۵ء کے بعد بابائے سندھ کامریڈ حیدر بخش جتوئی ہاری کمیٹی میں شامل ہوئے اور انکی رہنمائی میں ایک نیا جوش اور جذبہ پیدا ہوا۔ ۱۹۴۵ء اور ۱۹۴۶ء کے عام انتخابات میں ہاری کمیٹی کی طرف سے کامریڈ حیدر بخش جتوئی، قاضی فیض محمد، عبدالقادر ایم خان اور رمجی کولہی نے سندھ کے چوٹی کے جاگیرداروں کا مقابلہ کیا، حالانکہ وہ انتخابات میں تو کامیاب نہیں ہوئے مگر انتخابی مہم کے دوران ہاری کمیٹی کی پہچان، کسانوں میں اعتماد اور طبقاتی تضاد کو واضح کر دیا۔ یہ کامیابیاں بھی کوئی چھوٹی موٹی کامیابیاں نہیں تھیں۔ ۱۹۴۷ء میں سرہاری کانفرنس میں متفقہ طور پر "آدھی بٹائی" کی قرارداد منظور کی گئی تو سانگھڑ، نوابشاہ اور تھرپارکر کے علاقوں میں کسانوں نے زمینداروں کو آدھی بٹائیؒ سے زیادہ دینے سے انکار کر دیا اور کئی جگہوں پر تو کسان کارکنوں نے خود کھڑے ہوکر آدھی بٹائی کی جس کی وجہ سے کئی جگہوں پر زمینداروں اور مقاطعہ داروں نے کسانوں پر حملے کئے جس کی وجہ سے مائی بختاور شہید، بالاچ خان بروہی اور کئی دیگر کسان شہید ہوگئے۔ مگر اس جدوجہد نے تحریک کی شکل اختیار کرلی اور تحریک نے ہاری کمیٹی کی طرف سے ۱۹۴۳ء میں پیش کردہ "سندھ ٹیننسی ایکٹ" بل کو منظور کرنے کیلئے اسمبلی ممبران اور سندھ حکومت پر دباؤ بڑھا دیا۔ مذکورہ بل میں آدھی بٹائی کے حق کو ماننے، چھیڑ بیگر کے خاتمے، بے دخلی کو روکنے، کاشت کے حق پر زمین الاٹمنٹ اور دیگر اہم حقوق پر مبنی مطالبات شامل تھے۔ ۳ مارچ ۱۹۴۷ء کو سر راجر ٹامس کی سربراہی میں مسعود کھدرپوش، نورالدین صدیقی اور آغا شاہی پہ مشتمل، سفارشات کے لئے ایک کمیٹی تشکیل دی گئی۔ ابھی اس نے کام کی ابتداء ہی کی تھی کہ پاکستان اور ہندوستان کا بٹوارہ ہوگیا اور سندھ پاکستان کا صوبہ بن گیا۔

پاکستان کا قیام۔ زرعی نظام کی ٹوٹ پھوٹ۔ ۱۹۴۸ء سے ۱۹۵۰ء تک۔

پاکستان کے قیام کے بعد کسانوں کی جدوجہد، سندھ ٹیننسی ایکٹ کو منظور کرانے کے لئے دباؤ کی صورت میں جوں کی توں موجود تھی۔ اس لئے ۶/جون ۱۹۵۸ء کو پاکستان سے پہلے قائم کردہ سر راجر ٹامس سفارشی کمیٹی کو کام کرنے کی ہدایت کی گئی اور اس نے ایک سفارشی رپورٹ پیش کی جس سے کمیٹی کے ممبر جناب مسعود کھدر پوش نے اختلاف کیا اور اختلافی رائے دی۔ پھر مارچ ۱۹۴۹ء میں سندھ اسمبلی نے مذکورہ رپورٹ کو حتمی شکل دینے کے لئے اسمبلی کے ۲۱ ممبروں پہ مشتمل ایک کمیٹی تشکیل دی اور اسے ۱۴ دن کے اندر رپورٹ پیش کرنے کی ہدایت کی۔ جس نے رپورٹ پیش کرنے میں ۱۲ ماہ لگا دیئے مگر پھر بھی نتیجہ نہیں نکلا۔ پھر آٹھ ممبروں پر مشتمل ایک سب کمیٹی تشکیل دی گئی۔ دونوں کمیٹیاں جاگیردار ممبروں پر مشتمل تھیں اس لئے ان سے ہاری دوست بل کی حمایت میں سفارشیں دینے کی توقع رکھنا ہی فضول تھی۔ وہی ہوا۔ سب کمیٹی نے ٹیننسی ایکٹ کو کسان دشمن ایکٹ بل میں تبدیل کر دیا۔

کسانوں کے دباؤ کو نتیجے میں باآخر اس بل پر یکم اپریل ۱۹۵۰ء سندھ اسمبلی میں بحث شروع ہوئی تو ۳۔ اپریل کو سندھ ہاری کمیٹی کی اپیل پر کامریڈ جتوئی کی قیادت میں ہزاروں کسانوں نے کراچی پہنچ کر سندھ اسمبلی کا گھیراؤ کیا جس پر ممبر صاحبان نے بل منظور کرنے کی یقین دہانی کرائی اور اگلے دن ۴/اپریل ۱۹۵۰ء کو یہ بل منظور کیا گیا۔ مگر بحث کے دوران ایوب کھوڑو کی ۲۲ کسان دشمن ترامیم منظور کر کے اس بل کی صورت مزید بگاڑ دی گئی اور یہ بل کسانوں کے لئے قابل قبول نہ تھا لہٰذا جدوجہد کو جاری رکھا گیا۔ جس پر اس وقت کے سندھ کے گورنر شیخ دین محمد سے کامریڈ جتوئی نے اسیری کی حالت میں ملاقات کی اور اس کو کسان کے فائدہ میں ترامیم پیش کیں جو حکومت سندھ نے فروری ۱۹۵۲ میں منظور کر کے بل کو نئی شکل میں جاری کیا۔ سندھ ٹیننسی ایکٹ کا منظور ہونا سندھ کی ہاری تحریک کے لئے بڑی کامیابی تھی، جس کی وجہ کسانوں کی وسیع تر تنظیم، منظم جدوجہد اور اہل قیادت تھی۔ جس کی وجہ سے جاگیرداری مظالم پر قانونی پابندیوں کا جواز پیدا ہوا جس کے ظلم و ستم میں کمی آئی۔ اور کسانوں کے لئے مزید قانونی رعایتوں کے لئے قانونی بنیاد پیدا ہوئی اور کسانوں کے اعتماد میں اضافہ ہوا۔ آگے چل کر ۱۹۵۴ء میں سندھ کی زمین جو کہ کوٹری بیراج کے علاقے میں کلیمنٹوں کو الاٹ ہو رہی تھی اس کے خلاف اثر انگیز الائی تحریک چلائی گئی جس کی وجہ سے ہزاروں بے زمین کسانوں کو زمین الاٹ ہوئی۔ یہ کامیابی بھی

اپنی نوعیت کے لحاظ سے بڑی کامیابی تھی۔ اس کے اثرات ابھی پھیلنے ہی نہ تھے کہ ایوب خان ۱۹۵۸ء میں ملک کے سیاہ سفید کا مالک بن گیا اور اسکندر مرزا نے ایک مہرے کی شکل اختیار کرلی۔

ایوب خان کی زرعی نظام میں لائی گئیں تبدیلیاں

چھ سال کی مسلسل سیاسی چھینہ جھپٹی اور اقتدار کی بھاگ دوڑ، حکومتوں کی بننے اور ٹوٹنے کے عمل نے ایوب خان کے لئے اقتدار پر قبضہ کرنے کے لئے راہ ہموار کردی تھی، ملک پر مارشل لاء کے نفاذ اور پھر ۱۹۵۷ء میں مغربی پاکستان کو ون یونٹ میں تبدیل کر دیا گیا۔ اسی طرح سندھ کی تاریخی حیثیت کو ختم کر کے ایک ناپاک سازش کی اور سندھ کو قوموں کے قید خانے میں مکمل طور پر جکڑ دیا گیا۔ ایوب خان نے زرعی نظام میں کئی تبدیلیاں لائیں جس سے زرعی نظام میں مقداری تبدیلیاں کیں اور زراعتی نظام سے وابستہ رشتوں، ناتوں اور معیاروں میں بھی ایک قسم کی تبدیلی آئی۔ یہ تبدیلیاں مندرجہ ذیل تھیں۔

۱۔ ایوب خان نے "سبز انقلاب" کا نعرہ دے کر زرعی اصلاحات نافذ کیں۔ جاگیرداری نظام کا خاتمہ کیا گیا اور زمین کی حد ملکیت فی فرد ۵۰۰ ایکڑ نہری اور ۱۰۰۰ ایکڑ بارانی مقرر کی گئی۔ جاگیرداروں سے چھینی گئی لاکھوں ایکڑ رقبہ زمین کسانوں کو الاٹ کی گئی۔

۲۔ زرعی نظام میں مشینی کھیتی باڑی کو متعارف کرانے کے لئے ٹریکٹر، کھاد اور ٹیوب ویل برآمد کیئے گئے اور انکو زرعی میدان میں استعمال کیا جانے لگا۔

۳۔ زراعت سے وابستہ کپاس اور گنے کی فیکٹریاں لگا کر زراعت اور صنعت کا ایک دوسرے پر انحصار کرنے والی صنعتی پالیسی کی ابتدا کی گئی۔

۴۔ گڈو بیراج اور کوٹری بیراج تعمیر کروا کر ۲۱،۰۷،۰۰۰ ایکڑ رقبے کو آباد کرنے کے لئے آبپاشی کا نظام قائم کیا گیا جس سے ایک طرح سے زرعی پیداوار میں انقلاب آگیا۔ کسانوں اور چھوٹے کھاتیداروں کی خوشحالی کی شرح میں اضافہ ہوا۔

۵۔ بنیادی جمہوریت کا نظام رائج کر کے ایوب خان نے یونین کاؤنسل اور ڈسٹرکٹ کاؤنسل کی سطح پر متوسط دیہاتی لوگوں، چھوٹے زمینداروں کے نئے سیاسی گروہ کو جنم دیا جس سے جاگیردارانہ سیاسی اثر و رسوخ کو زک پہنچائی گئی۔

۶۔ فوجیوں کو زمین الاٹ کر کے ان کو زمینداری میں حصہ دار بنایا گیا اور اس طرح حکومت میں انکے مستقل مفاد کو شامل کیا گیا اور انکے مفادات زمینداری از زراعت سے وابستہ کئے گئے۔

مذکورہ تبدیلیوں سے زرعی نظام کے ڈھانچے میں تبدیلیاں آئیں۔ مشینی کاشت کی وجہ

سے کسانوں کی بے دخلی کی ابتدا ہوئی۔ زرعی اجناس کے لئے مارکیٹ میں وسعت پیدا ہوئی۔ جاگیرداری نظام قانونی طور پر ختم ہوا اور سماجی ترقی کی نئی راہیں کھلیں اور زراعت سے وابستہ لوگوں کی قوت خرید میں اضافہ ہوا۔ سابقہ جاگیرداروں نے زرعی اصلاحات سے بچنے کے لئے ریوینیو کھاتے کے آفیسروں سے ملی بھگت کر کے کھاتے میں جھوٹے ناموں سے تبدیلی کرائی اور یوں انہوں نے غیر قانونی طور پر زمینداری شکل اختیار کرلی۔ اس کے باوجود لاکھوں ایکڑ رقبہ کسانوں میں تقسیم کیا گیا اور جاگیرداری آب و تاب ماند ہوئی۔ ان تبدیلیوں کی وجہ سے زراعت میں نئے تضاد پیدا ہوئے۔

(الف) زمین کی الاٹمنٹ اور زرعی اصلاحات۔ یہ صحیح عمل نہ ہونے کی وجہ سے کسانوں اور چھوٹے کھاتے داروں کا زمینداروں اور ریوینیو کھاتے کے عملداروں کے ساتھ تضاد نے جنم لیا۔

(ب) بڑے زمینداروں کے ساتھ کسانوں اور چھوٹے کھاتیداروں کی مشترکہ تضادات نے ان میں اتحاد کے لئے راہ ہموار کی۔

(ج) گدو بیراج اور کوٹری بیراج کی کمانڈ ایریا میں غیر سندھی لوگوں کو مختلف سندھ دشمن اسکیموں کے تحت، مثلاً منگلا ڈیم تربیلا ڈیم اور اسلام آباد کے متاثرین کی بحالی، ڈیفنس فورس، فوجی فاؤنڈیشن، انعام اور نیلام وغیرہ کے تحت لاکھوں ایکڑ رقبہ دیا گیا۔ اعداد و شمار کے مطابق گدو بیراج کی کمانڈ ایریا میں ڈیفنس فورس اسکیم کے تحت ۸۷،۳۰۰ ایکڑ، اسلام آباد کے متاثرین کو ۱۵،۸۶۷ ایکڑ، منگلا ڈیم کے متاثرین کو ۴۶،۹۰۰، فوجی روارڈ اسکیم کے تحت ۳۱،۵۰۰ ایکڑ، فوجی فاؤنڈیشن اسکیم کے تحت ۹،۹۰۰ ایکڑ، نیلام کے تحت ۴۴،۷۴۴ ایکڑ اور انعام کے تحت ۱۲،۲۱۷ ایکڑ رقبہ پنجابی جرنیلوں، چودھریوں اور ریٹائرڈ سرکاری آفیسروں میں تقسیم کیا گیا۔ اسی طرح کوٹری بیراج کے کمانڈ ایریا گیارہ لاکھ ایکڑ رقبے میں سے ۶،۵۰،۰۰۰ ایکڑ رقبہ پنجابیوں، پٹھانوں اور کچھ بنگالیوں اور بلوچوں میں بھی تقسیم کیا گیا۔ جن میں سے ۱،۷۰،۰۰۰ ایکڑ پنجابیوں کو، ۳۴،۵۰۰ ایکڑ پٹھانوں کو نیلام اسکیم کے تحت دیا گیا۔ جبکہ ۱۹۶۸ء سندھی کھاتیداروں کو الاٹ گئی زمین جو کہ ڈیڑھ لاکھ ایکڑ تھی مختلف قانونی جواز پیدا کر کے اس میں سے ۷۰ فیصد زمین غیر سندھیوں کو الاٹ کی گئی۔ اس کے علاوہ ۱۷،۲۹۲ ایکڑ ٹریکٹر اسکیم کے تحت پنجابیوں کو الاٹ کی گئی۔ اس کی وجہ سے سندھی اور غیر سندھی کے درمیان زمین کے حق مالکی اور تقسیم کے سلسلے میں تضاد پیدا ہوگیا جو بعد میں شدت اختیار کرتا چلا گیا۔

(د) کلیموں کے گورکھ دھندھے کے ذریعے سندھ چھوڑ کر جانے والے ہندوؤں کی زمین اور ملکیت (جس میں زمین اصل میں سندھیوں کی تھی جو کہ ہندوؤں کے پاس قرضے کی وجہ سے گروی تھی) ہندوستان چھوڑ کر سندھ میں آنے والے پناہگیروں میں تقسیم کی گئی۔ اعداد و شمار

شاہد ہیں کہ ضلع خیر پور میں ۲۹،۳۹۵ ایکڑ اور دادو میں ۵۴،۱۹۶ ایکڑ زمین پناہ گیروں میں تقسیم کی گئی۔ کلیمنٹ حضرات کو لاہور جا کر ایک کاغذی قسم نامہ بھرنا پڑتا تھا اور [illegible] بھر کر سندھ کی زمین کا مالک بن جاتا تھا حالانکہ ان میں بے شمار لوگ ایسے تھے جن کو کپاس اور سفید پھول میں تمیز کرنا بھی نہ آتی تھی۔ اس سے سندھی ہاریوں اور کھاتیداروں بمقابلہ کلیمنٹ حضرات کے ساتھ ایک نیا تضاد ابھرا۔

(ہ) مشینی کاشت کی وجہ سے بے دخلی کے اضافے کا تضاد۔

(و) زرعی اجناس کی خرید و فروخت سرکاری بنیادوں پر نہ کرنے کی وجہ سے بیوپاریوں اور کمیشن ایجنٹوں کی ایک نئی فوج تیار ہو گئی اور انہوں نے سرکاری نرخوں سے کہیں کم پر زرعی اجناس کو خریدنا شروع کر دیا، جس سے کسانوں اور چھوٹے کھاتے داروں کا صحیح قیمت نہ ملنے پر ایک تضاد پیدا ہوا۔ اس تضاد نے مہاجر سرمائے کاری اور پنجابی بالادستی کے لئے زرعی اجناس کے آزادانہ بیوپار پر قبضہ کے لئے راہ ہموار کی۔

ان تضادات کو سامنے رکھ کر ہاری کمیٹی نے ہر اول کا کردار ادا کیا اور اس کا کردار اس وقت کی سیاسی پارٹیوں سے بھی زیادہ اہم تھا۔ خاص طور پر ون یونٹ مخالف تحریک میں ہاری کمیٹی کے رہنما کامریڈ جتوئی کی جدوجہد کی وجہ سے اسے "بابائے سندھ" کا لقب دیا گیا اور کامریڈ جتوئی کے نعرے "جئے سندھ" نے وہ مان پائی کہ وہ آج سندھی قوم کی پہچان بن گیا ہے۔ اس جدوجہد کی وجہ سے ایوب شاہی نے کامریڈ جتوئی کو مسلسل جیلوں میں بند رکھا، قاضی فیض محمد عوامی لیگ اور غلام محمد لغاری نیپ (NAP) میں چلے گئے، باقی قیادت اتنی فعال نہ تھی اس لئے ہاری جدوجہد ساتویں دھائی کے آخری سالوں میں ماند پڑ گئی۔ اوپر سے بھٹو نے دیہات میں جا کر کسانوں، کھاتیداروں اور چھوٹے زمینداروں کو جاگیردار زمیندار اور سرمائے دار دشمن ریڈیکل قسم کے نعرے دیئے اور ۷۰ء کے عام انتخابات میں سندھ کے دیہات سے ۸۰ فیصد سے ۸۵ فیصد ووٹ لے کر جیت گیا۔ عام انتخابات کے نتیجوں کو نہ ماننے کی وجہ سے بنگال میں بغاوت کی آگ بھڑک اٹھی۔ یحییٰ شاہی نے فوج کے زور پر عوام کی آواز کو کچلنے کی کوشش کی گئی مگر اسے نہیں دبایا جاسکا اور بنگلہ دیش وجود میں آ گیا۔ اور باقی ماندہ پاکستان کی حکومت بھٹو کے حوالے کی گئی۔

اس سارے دور میں ون یونٹ مخالف تحریک میں خاص طور پر اور عام انتخابات میں عام طور پر ہاری تحریک کا ایک کردار رہا ہے جس کو تاریخ کے نقاد نہیں جھٹلا سکتے۔

بھٹو حکومت کا زرعی نظام

بنگلہ دیش کے علیحدہ ہو جانے کے بعد امریکی سامراج اور ہاری ہوئی پاکستانی فوج نے اقتدار

بھٹو کے حوالے کیا، جس نے زمینداری نظام میں مزید دراڑیں پیدا کر دیں اور زرعی نظام میں نئی تبدیلیاں لایا۔

۱۔ زرعی اصلاحات نافذ کر کے زمینداری نظام کی قانونی حیثیت کو مزید کم کر کے زمین کی حد ملکیت ۱۵۰ ایکڑ نہری اور ۳۰۰ ایکڑ بارانی فی فرد مقرر کی گئی۔

۲۔ ٹریکٹر، تھریشر، کلٹیویٹر، بلڈوزر، ٹیوب ویل، زرعی اوزار، زرعی ادویات اور یوریا کو بڑے پیمانے پر متعارف کرایا گیا، اس طرح سے زرعی میدان میں مشینی کھیتی باڑی کی مضبوط بنیادیں پیدا ہوئیں۔

۳۔ زرعی اصلاحات کی وجہ سے بے زمین کسانوں کی تعداد کم ہوئی۔

۴۔ دیہاتی علاقوں میں روڈ اور بجلی پہنچا کر زرعی اجناس کو مارکیٹ تک پہنچانے کے لئے سہولتوں کو فروغ دیا گیا اور دیہات میں اسکولوں کے کھلنے سے زمین داری رعب میں کمی آئی اور طبقاتی جبر کے خلاف نفرت میں اضافہ ہوا۔

۵۔ زمینداروں کو سیاسی طور پر خوار کرنے کے لئے ھاری کانفرنس بلا کر غریب سیاسی کارکنوں کے ذریعے ان سے جواب طلبی کی گئی۔

۶۔ زرعی اجناس کے نرخوں میں اضافہ ہوا، جس سے کسان اور چھوٹے کھاتے داروں کی قوت خرید میں اضافہ ہوا۔

۷۔ یوریا اور چینی کے مزید کارخانے لگائے گئے۔ رائیس اور جننگ ملنگ کارپوریشن کا قیام عمل میں لایا گیا اور اس طرح سے زمینداروں کو صنعتی میدان میں سرمایہ لگانے کی ترغیب دی گئی اور ابھرتی ہوئی بورژوازی (RISING BOURGEOISIE) وجود میں آنے لگی۔

۸۔ چھوٹے کاشت کاروں اور کسانوں کو کاشت کے حق پر زرعی قرض فراہم کر کے ان کو بیج اور زرعی ادویات خریدنے کی سہولت فراہم کی گئی۔

مذکورہ تبدیلیوں کے سبب زرعی نظام میں قریباً قریباً انقلاب آگیا، جس نے زمینداری نظام کی سیاسی معاشی اور سماجی حیثیت کو سخت چوٹ پہنچائی اور سماج میں نئے ابھرتے ہوئے بورژوازی نے جنم لیا جس نے سالوں سے زرعی پیداوار سے حاصل ہونے والی دولت کو ہفتوں میں لگانا شروع کر دیا۔ اس نے زرعی سماج میں پرانے تضادات کے ساتھ نئے تضادات کو بھی جنم دیا جس کو ابھار کر ایک بڑی کسان تحریک جوڑی جاسکتی تھی۔

(الف) زرعی اصلاحات سے بچنے کے لئے کی گئی دھاندلیوں کے تضاد ابھار کر اس پر صحیح، صحیح عمل کرانا اور مزید بہتر قانون منظور کرنا۔

(ب) بچی ہوئی سرکاری زمین کسانوں کو الاٹ کرانا۔

(ج) پہلے دیا گیا لاکھوں ایکڑ رقبہ جو کہ غیر سندھیوں کو دیا گیا تھا وہ رد کروا کر سندھی کسانوں اور چھوٹے آبادگاروں میں تقسیم کرانا۔

(د) زرعی اجناس کے نرخوں میں مزید اضافہ کرانا اور زرعی ٹیکنالوجی کو سستے نرخ پر فراہم کرنا۔

(ھ) زمینداری ظلم اور کسانوں کے بے دخلی کے خلاف جدوجہد کرانا۔

(و) کسانوں اور دیہات کی سماجی ترقی کی رفتار کو تیز کرانا۔

(ز) کسان کانفرنس کروا کر کسانوں اور چھوٹے آبادگاروں میں، طبقاتی، قومی اور جمہوری سیاسی شعور پیدا کرنا۔

(ح) ریوینیو کھاتے کی دھاندلیوں، پولس اور آفیسر شاہی کے مظالم اور غیر قانونی اقدامات کے خلاف جدوجہد کرنا۔

(ط) زمین سے بے دخل ہونے والے زراعت سے وابستہ افراد کی تعلیم یافتہ اولاد کو روزگار دلانا۔

یہ تمام وہ بنیاد تھے جن کو استعمال کر کے کسان تحریک منظم، وسیع اور طاقتور بنائی جا سکتی تھی۔ مگر ایسا نہیں کیا گیا۔ کامریڈ جتوئی کی موت کے بعد ہاری کمیٹی کی قیادت ذاتی نفعے حاصل کرنے میں مشغول ہو گئی اور ۱۹۷۱ء سے لے کر ۱۹۷۸ء تک ہاری کمیٹی تنظیم کی حیثیت سے سندھ کی سیاسی، فوجی اور طبقاتی جدوجہد کے میدان میں پیچھے رہ گئی۔ اس دوران کچھ دیگر ہاری تنظیمیں جیسے سندھی ہاری تحریک وغیرہ وجود میں آئیں مگر انہوں نے بھی کوئی ہاری تحریک منظم نہیں کی۔ اس دوران برابری کی بنیاد پر سندھی ہاری کمیٹی سے وابستہ ساتھی کامریڈ مانددھل تھر نے میرپور ماتھیلو کے علاقے میں منگلا ڈیم اور اسلام آباد کے متاثرین کو الاٹ کی گئی زمین پر کسانوں کو قبضہ کرانے والی جدوجہد کی قیادت کی اور پنو عاقل کے علاقے میں کامریڈ عبدالقادر اندھڑ نے فوجی فاؤنڈیشن اسکیم کے تحت دی گئی زمین سے پانچ ہزار ایکڑ رقبے پر کسانوں سے قبضہ کروایا جس کے دوران فوجیوں سے پہلی مسلح جھڑپ ہوئی۔ یہ فوج اور سندھی کسانوں کی پہلی مسلح جھڑپ تھی جسے دنیا کی بڑی بڑی خبر رساں ایجنسیوں نے اہم خبر کی صورت میں جاری کیا۔ نواب شاہ کے علاقے میں ریہ ونگ اور رانہب شاہ کی کسان جدوجہد بھی اس دور کی جدوجہدوں میں سے ایک گنی جا سکتی ہے۔ مگر یہ تمام واقعات کسی بڑی تحریک کو جنم دے نہ سکے۔ اگر زرعی تضادات کو تیز کر کے ہاری جدوجہد کو منظم کیا جاتا تو یہ نہ صرف انقلابی پیش قدمی کے لئے طاقتور قوت ہوتی مگر خود اس وقت کی جمہوری حکومت کو ناکام بنانے اور سامراج کے اشارے پر چلائی گئی PNA کی ڈالر تحریک کے لئے بڑی رکاوٹ بھی بنتی اور برا ردعمل وقت

پر ہی رونما ہوتا۔ شہری علاقوں میں موجود کمزور جمہوری تحریک کو طاقت ملتی اور ■ اپنے احتجاج کو شہروں سے دیہات تک جوڑتے اور پھر اگر جمہوری حکومت کے خلاف سازش کو ناکام نہ بنایا جاسکتا تو کم سے کم چنے ہوئے وزیر اعظم کو پھانسی پر نہ چڑھایا جاتا اور ضیأ شاہی یوں طویل عرصے تک مسکین اور محکوم لوگوں پر اتنے بڑے ظلم نہ ڈھاتی۔

ضیاء شاہی اور کسان جدوجہد

بھٹو کی جمہوری حکومت کو ختم کر کے فوجی طاقت کے ذریعے مارشل لاء لگا دیا گیا اور ضیاء شاہی کا طویل ظالمانہ دور ملک پر مسلط ہو گیا۔ اس فوجی بغاوت کے دیگر اسباب کے ساتھ ساتھ بھٹو کے زرعی اصلاحات، زمینداروں کے ابھرتے ہوئے بورژوازی میں تبدیل کرنا اور اس طرح گماشتہ اجارہ دار سرمائے دار کے سامنے تحفظ یافتہ بورژوازی پیدا کرنا، زراعت سے وابستہ ملٹک کارپوریشن کا قیام عمل میں لانا، زرعی اجناس کی قیمتوں میں اضافہ کرنا، زراعت سے وابستہ بنیادی صنعتیں لگانا، بھی ایسے سبب تھے جو عالمی سامراج، پنجابی فوج، پنجابی بالادستی، اور مہاجر سرمایہ کاروں کے لئے قابل قبول نہ تھے۔ اس لئے یہ بغاوت کی گئی۔ یوں زرعی نظام میں کسانوں اور چھوٹے کھاتیداروں کو ملنے والی سہولتوں اور سامراجی اثر نفوذ سے پاک زرعی ترقی کو روکنے کے لئے ضیأ شاہی نے مختلف حکمت عملیاں بنائیں جو یہ تھیں۔

۱۔ آبیانے ریٹ میں اضافہ کیا گیا، جو کہ پنجاب کے مقابلے میں دگنا تھا، اس کے ساتھ عشر کا نظام لاگو کیا گیا۔ اس طرح سے کسانوں اور چھوٹے کھاتیداروں کے لئے معاشی بدحالی پیدا کی گئی۔

۲۔ بچی ہوئی سرکاری زمین جھوٹے ناموں پر ایسے زمینداروں کو الاٹ کی گئی جن کی اکثریت بلواسطہ یا بلا اوسطہ ضیأ حکومت کی حامی تھی، جن میں اکثر کی زمین پہلے ہی ہزاروں ایکڑ میں پھیلی ہوئی تھی۔ اور انہوں نے زرعی اصلاحات سے بچنے کے لئے کھاتوں کی ردوبدل سے اپنے قبضے میں ہی رکھی تھی۔ اس طرح زمینداروں کو ایک نئی قوت ملی۔

۳۔ یوریا، زرعی ادویات، ٹریکٹروں، تھریشر اور دیگر زرعی اوزاروں کے نرخ بڑھا دیئے گئے، دوسری طرف زرعی اجناس کی قیمتوں میں اس تناسب سے اضافہ نہ ہوا۔ جس کی وجہ سے فی ایکڑ پیداوار اور خرچ کے توازن میں کوئی بڑا فرق نہیں رہ گیا۔ اور کہیں کہیں تو کئی فصلوں میں فی ایکڑ خرچ پیداوار بڑھ گیا۔ اس صورت حال نے کسانوں اور چھوٹے کھاتیداروں کی قوت خرید میں کمی کردی اور ان کی تنگ دستی میں اضافہ ہوا۔

۴۔ صنعتی میدان میں ایک بار پھر گماشتہ اجارہ دار سرمایہ دار اور غیر ملکی سرمایہ کاروں کو

تحفظ فراہم کیا گیا اور ایسا ماحول پیدا کیا گیا کہ بھٹو حکومت میں ابھرنے والی قومی بورژوازی مقابلے میں نہ کھڑی ہو سکی۔ پرائیویٹ (چاہے سرکاری طور پر) زرعی مارکیٹ پر سامراجی اداروں، مہاجر سرمایہ کاروں اور پنجابی ایکسپورٹ فرموں نے قبضہ کر لیا۔

۵۔ مسلم لیگ اور مجلس شوریٰ کے برانڈ کے تحت بڑے زمینداروں اور سرداروں کی دلال فوج تیار کی گئی جسے آفیسر شاہی حکم ماننے کی ہدایت کی گئی اور قومی خزانے سے ایک کثیر رقم ان کے حوالے کی گئی مگر ساتھ میں ان پر نظرداری رکھنے کے لئے فوج کو ان سے زیادہ بااختیار رکھا گیا۔ یوں زمینداروں کا چھوٹے کھاتیداروں اور کسانوں پر ظلم کا ایک نیا باب شروع ہوا۔

۶۔ ایک بار پھر کھلے عام غیر سندھیوں کو مختلف اسکیموں کے تحت زمین الاٹ ہونے لگی۔ صرف لائیو اسٹاک فارم اسکیم کے تحت کاچھو (ضلع دادو) میں ۶۷ آدمیوں میں ۱،۹۲،۰۰۰ ایکڑ، ٹھٹھہ ضلع میں ۲۵،۰۰۰ ایکڑ سپر ہائی وے پر ۲۲۰ آدمیوں کو ۷۵،۰۰۰ ایکڑ زمین الاٹ کی گئی جس میں سے صرف ۲۹،۰۰۰ ایکڑ سندھیوں کو ملی۔ اس کے علاوہ فش فارم اسکیم کے تحت کم سے کم ۶۲۰۰۰ ایکڑ رقبہ غیر سندھیوں کو الاٹ کیا گیا۔ اس طرح سے سندھی اور غیر سندھی آبادگاروں کا تضاد اور شدید ہو گیا۔

۷۔ سیاسی اختلافات کی بنا پر سندھی دیہاتیوں پر فوج نے شب خون مارے، بے انتہا عقوبتی کیس، سینکڑوں بے گناہ دیہاتیوں کو شہید کیا گیا۔ اور کئی دیہات تباہ کر دیئے۔

۸۔ سندھیوں کی قبولی اور لیز پر لی گئی زمین فوجی مقصد چھاؤنیوں، ائیر پورٹ اور عارضی فوجی ہیڈ کوارٹروں کے لئے ہزاروں ایکڑوں کو قبضے میں لے لیا گیا۔ پنو عاقل چھاؤنی اس کی واضح مثال ہے۔ جس کے لئے ۲۷،۰۰۰ ایکڑ رقبے پر قبضہ کیا گیا۔ ۱۱۰ چھوٹے بڑے دیہات کو ختم کر کے، ۹۹ مساجد ڈھانے ۵ پرائمری اسکول ۲ ڈسپنسریاں ختم کرنے کا اور کم سے کم ۲۵ ہزار کسان خاندانوں کو بے دخل کرنے کے پروگرام پر تیزی کے ساتھ عملدرآمد جاری ہے۔ یہ علاقے ایسے ہیں جہاں پر کسی بھی بڑے زمیندار کی زمین نہیں ہے۔ سب چھوٹے کھاتے داروں کا رقبہ ہے۔

۹۔ بے دخل ہونے والے کسانوں اور ان کی اولاد کے لئے روزگار کے دروازے بند ہی رہے۔ اس لئے ان کی بدحالی میں مزید اضافہ ہوا۔

۱۰۔ سندھ کی آباد زمین کو غیر آباد کرنے کے لئے بھٹو حکومت کی تیار کردہ چشمہ لنک کینال کھول کر سندھ کے حصے کا پانی پنجاب میں استعمال کیا جانے لگا اور کالا باغ ڈیم جیسے خطرناک منصوبے پر کام شروع کیا گیا۔ یہ ایک نیا تضاد تھا جس کی شدت نے اسے سندھی لوگوں اور زراعت پیشہ افراد کے لئے زندگی اور موت کا مسئلہ بنا دیا۔

۱۱۔ بھٹو حکومت کے دور میں جاری کئے گئے زرعی قرض کے طریقہ کار مزید پیچیدہ بنائے

گئے تاکہ کسان اور چھوٹے کھاتے دار آسانی سے ساتھ اس سہولت سے فائدہ نہ اٹھا سکیں اور ان کے نام پر بڑے زمیندار اور بیوپاری قرضے لینے لگے۔ حکومت نے اس سلسلے میں کوئی باز پرس نہیں کی۔

۱۲۔ شہروں پر پنجابیوں اور غیر سندھیوں کے قبضے، کارخانوں میں روزگار نہ ملنے، مہاجر سندھی جھگڑوں نے سندھی دیہاتیوں کی دیہات سے شہروں کی طرف نقل مکانی کی رفتار کو ست تر کر دیا۔ جس سے سندھ کے شہروں اور دیہات میں بیگانگی اور اجنبیت پیدا ہوئی اور دیہاتی علاقوں میں بے روزگاری میں اضافہ ہوا۔

ان حکمت عملیوں کی وجہ سے سندھ کی زرعی ترقی باوجود اس کے کہ اس دور میں زرعی ٹیکنالوجی میں اضافہ ہوا، مہنگائی اور کسان اور چھوٹے کھاتیداروں کی قوت خرید کم ہونے کی وجہ سے یہ ٹیکنالوجی ان کی پہنچ سے باہر ہو گئی۔ صرف بڑے زمینداروں نے اس سے بھرپور فائدہ اٹھایا، مگر انہوں نے بھی اس ٹیکنالوجی کے اہم عنصر ٹریکٹر کو زرعی مقاصد پر استعمال کرنے کے بجائے صنعت میں استعمال کیا اور وزن بردار ٹرانسپورٹ وہیکل بن گیا۔ اعداد و شمار کے مطابق سندھ کے بڑے زمینداروں کے ۶۰ فیصد ٹریکٹر ان مقاصد کے لئے استعمال ہو رہے ہیں جو کل ٹریکٹروں کا ۳۰ فیصد بنتا ہے۔ اس وجہ سے عام زراعت پیشہ آدمی بے انتہا احساس محرومی، بھوک، بدحالی، اور سیاسی بے چینی کا شکار ہو گیا اور وہ افسر شاہی زمینداروں اور پولس کی ملی بھگت اور فوج کے مظالم سے تنگ ہو گئے اور ان کو اپنا مستقبل غیر محفوظ نظر آنے لگا اور زراعت میں نئے تضاد نے جنم لیا اور پرانوں نے شدت اختیار کر لی۔

۱۔ کسانوں اور چھوٹے کھاتیداروں کے مظالم میں اضافہ۔

۲۔ کسانوں اور چھوٹے کھاتیداروں کی قوت خرید میں کمی۔

۳۔ پیداوار اور خرچ کے توازن میں کوئی بڑا فرق نہ ہونے کی وجہ سے کسانوں اور چھوٹے کھاتیداروں میں بدحالی۔

۴۔ سماجی ترقی کو سست کر دیا۔

۵۔ زرعی بیوپار میں کمیشن ایجنٹ، بیوپاری اور سرمایہ داری لوٹ مار اور اثر رسوخ میں اضافہ۔

۶۔ سندھی دیہاتیوں کی قتل عام، عقوبتوں اور بربادیوں کا اضافہ۔

۷۔ ریونیو کھاتے کا لگان اور آبیانے کے ساتھ عشر کا لینا۔

۸۔ سندھ کے پانی پر قبضہ کرنے کا حقیقی خطرہ پیدا ہونا۔

۹۔ فوجی چھاؤنیوں کا قیام۔

۱۰۔ زرعی اصلاحات پر عمل نہ ہونا، الٹا پہلے سے زرعی اصلاحات کے تحت کھاتیداروں کی دی گئی زمین پر زمینداروں کا قبضہ۔
۱۱۔ سندھی مہاجر فسادات کے نتیجے میں سندھ کے دیہی علاقوں میں بے چینی کی شدت۔
۱۲۔ سندھ کی زمین پر غیر سندھیوں کے قبضہ پر احتجاج کی شدت۔
۱۳۔ بے روزگاری کے خلاف احتجاج اور سندھ کے روزگار کے اداروں میں غیر سندھیوں کے بھرتی کے خلاف رد عمل۔

یہ تمام تضادات ایسے تھے۔ جنہوں نے سندھی کسانوں، چھوٹے کھاتیداروں اور چھوٹے زمینداروں اور دیہاتیوں میں سیاسی بیداری، جدوجہد اور باغیانہ (انفرادی) رجحانوں کی بڑی لہر پیدا کر دی اور ان تمام تضادات کی واضح شکل ضیاء شاہی کے تمام مظالم اور عقوبتوں کے خلاف سندھی دیہاتی عوام کی بہادرانہ جدوجہد کی صورت میں ظاہر ہوئی۔ ۱۹۸۳ء اور ۱۹۸۶ء کی بحالی جمہوریت کی تحریکوں میں سندھی دیہاتیوں، کسانوں، چھوٹے کھاتیداروں اور چھوٹے زمینداروں اور ان پڑھی لکھی باشعور نوجوان نسل نے اہم ترین کردار ادا کیا اور وہ ان تحریکوں کی بنیادی قوت تھے جنہوں نے اپنے خون سے موجودہ جمہوریت کے لئے راہ ہموار کی۔ ضیاء ریفرنڈم اور جونیجو حکومت کو قبول نہ کیا۔ واضح رہے کہ جونیجو حکومت نے سندھ کے دیہی علاقوں میں سماجی ترقی اسکول، ہسپتال ،، روڈ اور بجلی کی ترقی میں اچھا خاصا اضافہ کیا جو کہ ضیاء شاہی کے آخر سالوں میں ہوا جس سے اس کا ملک گیر بنیادوں پر بڑا اثر نہ ہو سکا اور ضیاء شاہی کے مظالم اور پالیسیوں کے اثرات مضبوطی سے زراعتی نظام میں موجود رہے۔ حالیہ انتخابات میں سندھ کے اندر ضیاء شاہی کے حمایتی ٹولے کو دیہاتی علاقوں میں بڑی شکست ملی اور بہت بڑے سیاسی بت بہہ گئے اور سیاست میں نئے انداز متعارف ہوئے۔ حقیقت میں پیپلز پارٹی کی فتح میں مذکورہ بالا تضادات کا موجود ہونا، بھٹو کے زرعی اصلاحات کی یاد، بے نظیر کا اس کی بیٹی ہونا اور سندھی عورت ہونا اور مسلسل ضیاء شاہی کے عذاب میں بھٹو خاندان کا رہنا اور پروپیگنڈہ ذرائع کا وسیع تر ہونا وہ بنیاد تھے۔ جنہوں نے پی پی پی کی فتح میں اہم کردار ادا کیا اور اس فتح کا رنگ قوم پرستانہ ضرور تھا۔

ہاری فرنٹ کی صورت حال اور نتائج

گذشتہ گیارہ سالوں کے دوران کسانوں کے حقوق کی دعویدار تنظیموں نے یا خود سندھ ہاری کمیٹی نے کسانوں میں اپنے لئے کوئی بڑا اعتماد، تنظیم اور اثر و رسوخ والی صورتحال پیدا نہیں کی۔ سندھ ہاری کمیٹی دوبارہ ۷۸ء میں چند دوستوں کی موجودگی میں وجود میں آئی اور اس نے نوجوان

قیادت میں کام کرنا شروع کر دیا۔ ابتداء میں کام کی رفتار اچھی تھی مگر جلد ہی اس پر ماضی کی باقیات حاوی ہو گئیں اور کمیٹی پر سیاسی رنگ حاوی ہو گیا۔ ہوا یوں کہ ہاری کمیٹی کی قیادت کی اکثریت کمیونسٹ پارٹی کے ڈسپلن کے ماتحت تھی اور وہ پارٹی انڈر گراونڈ تھی۔ حالانکہ ان گیارہ سالوں میں پارٹی کے سیاسی فرنٹ کے آدمی PNP اور بعد میں ANP میں شامل تھے مگر پارٹی کی سیاست کے لیے ہاری کمیٹی کے پلیٹ فارم کو استعمال کیا گیا اور ہاری کمیٹی کسانوں کی معاشی اور سیاسی تنظیم بننے کے بجائے پارٹی کا اوپن سیاسی پلیٹ فارم بن گئی، اس لئے کسانوں کے بنیادی اقتصادی اور سماجی مسائل پر کوئی بھی توجہ نہیں دی گئی اور ہاری کارکنوں کو پارٹی ٹاسک دے کر ہاری فرنٹ کے بنیادی کام سے بیگانہ کر دیا۔

اب بھی کسان فرنٹ کی صورت حال تسلی بخش نہیں ہے اور پارٹی کے بحران کی وجہ سے پارٹی کی طرح دو سال پہلے ہاری کمیٹی بھی دو حصوں میں تقسیم ہو گئی۔ جس کی وجہ سے وہ کام جو پہلے ہوا تھا تباہ ہو گیا۔ ساتھی مایوسی کا شکار ہوئے اور خاص طور پر ہاری کارکنوں نے اس کا خاص اثر لیا۔ بہر حال بچے کھچے ساتھیوں کے ہمراہ دسمبر ۱۹۸۷ء میں منعقدہ محراب پور کنونشن میں دوبارہ ابتدا کی گئی۔ ہمارے ساتھ ۷۳ ہاری یونٹ ہیں مگر ان کی اکثریت بے عمل ہے۔ کیونکہ محراب پور کنونشن میں چنے گئے عہدیداران اور مرکزی کمیٹی کے ممبر صاحبان کے تنظیم سے تعلق اور کام کی یہ رفتار رہی کہ ان میں اکثر مرکزی کمیٹی کے اجلاسوں سے تو گم ہی رہے مگر اپنے بنیادی یونٹوں کے اجلاس بھی نہ کرواسکے۔ مرکز اور یونٹوں کا رابطہ ٹوٹ گیا۔ جس کا ایک سبب بھی ہماری یہ پارٹی رہی ہے۔ ہاری فرنٹ پر کام کرنے والے ساتھی پارٹی سیاست کے کنفیوژن کا شکار ہو کر بے عمل ہو گئے۔ ہاری کمیٹی کی باعمل قیادت صدر اور سیکریٹری نے بھی ہاری فرنٹ کو زیادہ وقت نہیں دیا۔ یہ سلسلہ ایک سال تک چلتا رہا ہے جس کی وجہ سے اور تو اور ہم لوگ ماضی کی روایات کو زندہ رکھتے ہوئے "بابائے سندھ" کی برسی بھی اس سطح پر نہ منا سکے جو گذشتہ آٹھ سال سے منا رہے تھے۔ مگر گذشتہ چند مہینوں سے صورت حال بہتر ہوئی ہے، مرکزی عہدیداروں اور ممبروں سے گاؤں گاؤں جا کر ملاقات کی گئی ہے جس سے مرکز اور یونٹوں کے درمیان رابطہ قائم ہوا ہے۔ اس عرصے کے دوران سندھ ہاری کمیٹی کا ایک رخ بہت مثبت اور باعمل رہا ہے۔ وہ ہے اس کا سندھ کی سیاست میں بھرپور سائنسی کردار۔ سندھی عوام کے قومی اتحاد کی میزبان تنظیم سندھ ہاری کمیٹی تھی۔ اتحاد میں شرکت کے لئے دعوت دینے کے سلسلے میں ہاری فرنٹ کے انچارج کامریڈ غلام رسول سہتو کا کردار قابل تعریف ہے جس نے مختصر وقت اور محدود وسائل کے ہوتے ہوئے سندھ کی تمام جمہوریت پسند، ترقی پسند اور قوم پرستوں کو اتحاد میں شامل ہونے کے لئے مدعو کیا۔ اس اتحاد میں اگرچہ کافی قوتیں شامل نہیں ہوئیں مگر پھر بھی اتحاد کے عمل،

مظاہروں اور جلسوں اور پروپیگنڈہ نے سندھی عوام کے ان جذبوں کی ترجمانی کی جو سالوں سے ان کے دل و دماغ میں پروان چڑھ رہے تھے کہ سندھیوں کی بقا کے لئے ایک باعمل اتحاد ہونا چاہیئے۔ سندھی عوام کے قومی اتحاد نے نہ صرف ان کے جذبوں، امنگوں اور امیدوں کا کسی حد تک پورا کیا مگر اس کے ساتھ ساتھ ان سندھ دوست قوتوں کو جو کہ اتحاد سے باہر تھیں اور سندھ کی آزادی کے سوا کسی بھی نقطے پر اتحاد کرنے کے لئے تیار نہیں تھیں۔ ان کو نقاط پر اتحاد کرنے کے لئے مجبور ہونا پڑا اور انہوں نے مثبت عمل کا مظاہرہ کرتے ہوئے سندھ قومی اتحاد کا قیام عمل میں لایا جو ابھی تک قائم ہے۔ اپنے غیر جمہوری عمل اور عملی جدوجہد کی کمی اور مہم جوریوں کے باوجود یہ اتحاد سندھی عوام اور خاص طور پر سندھ کے دیہاتی لوگوں، کسانوں، چھوٹے کھاتیداروں اور چھوٹے زمینداروں کی ضرورت ہے۔ اور مستقبل میں سیاسی جدوجہد اور قومی بقا کی جدوجہد میں متبادل ہوسکتا ہے۔ تاریخ کے نقاد اس عمل میں سندھ ہاری کمیٹی کے کردار کو نہیں جھٹلا سکتے۔ اس وقت سندھ کے اندر سندھ ہاری کمیٹی کے علاوہ، جئے سندھ ہاری سنگت، سندھی ہاری تحریک، جام ارباب گروپ کی سندھ ہاری کمیٹی اور پیپلز ہاری کمیٹی کام کر رہی ہیں۔ جیئے سندھ ہاری سنگت کسانوں کے بنیادی مسائل پر جدوجہد کرنے کی بجائے سندھ کی علیحدگی کی تحریک کو بنیادی اہمیت دیتی ہے۔ اس کی نظریاتی اساس جیئے سندھ تحریک کی نظریاتی اساس ہے۔ اس تنظیم کا اثر ورسوخ عام کسانوں کی بجائے جیئے سندھ تحریک کے ہمدردوں میں ہے جو کہ پڑھے لکھے دیہاتیوں، محب وطن سندھی، چھوٹے زمینداروں اور کچھ سندھی اساتذہ تک محدود ہے۔ یہ تنظیم طبقاتی تضادات کو کوئی اہمیت نہیں دیتی۔ سندھی ہاری تحریک پرانی ہاری تنظیم ہے جو کہ پچھلی دو دہائیوں سے کام کر رہی ہے اور اس کی نظریاتی اساس پلیجو کی عوامی تحریک کی نظریاتی اساس ہے۔ اور پلیجو کے اے۔ این۔ پی میں شامل ہوجانے کے بعد ہاری تحریک عوامی تحریک کا اوپن فرنٹ ہے جہاں سے وہ ان تمام باتوں کا کھلا اظہار کرسکتے ہیں جس کا ANP کے پلیٹ فارم سے اظہار نہیں کرسکتے۔ حال ہی میں تو پلیجو نے خود سمیت ANP کے کئی اہم سیاسی رہنماؤں کو ھاری تحریک کی مرکزی کمیٹی کے ارکان منتخب کروایا ہے جس سے اس بات کے قوی امکانات ہیں کہ وہ اپنی مکمل سیاست اس پلیٹ فارم سے کریں گے۔ اس تنظیم کی قیادت میں ۶۹ء کوٹری بیراج کی زمین کی الاٹمنٹ میں ہونے والی دھاندھلیوں کے خلاف تحریک چلائی گئی تھی جس کی وجہ سے ٹھٹھہ، بدین، میرپورخاص اور حیدرآباد کے اضلاع میں کافی اثر ورسوخ پیدا ہوا تھا۔ مگر بعد میں اس تنظیم نے بھی ہماری طرح ہاری مسائل پر جدوجہد کرنے کے بجائے اسے سیاسی پارٹی کی طرح استعمال کیا تو یہ اثر کم ہو کر رہ گیا ہے، مگر اس کے باوجود اس کے پاس باشعور سیاسی کارکنوں کی ایک اچھی خاصی تعداد ہے جو اسے فعال کرسکتی ہے۔

جام ساقی اور ڈاکٹر ارباب کی مشترکہ سندھ ہاری کمیٹی ہم سے علیحدہ ہونے کے بعد نہیں بڑھ سکی ہے۔ ڈاکٹر ارباب کا جام ساقی کے ساتھ نظریاتی ہم آہنگی نہ ہونے کی وجہ سے کمیٹی نظریاتی کھچڑی کا شکار ہو گئی ہے۔ ایک ساتھ دو مرکز اور دو نظریاتی لائینوں کے کام کرنے سے اس تنظیم کا مستقبل روشن دکھائی نہیں دیتا اور مستقبل میں یہ ٹوٹ بھی سکتی ہے۔ پیپلز ہاری کمیٹی کی نظریاتی بنیاد پیپلز پارٹی کے سیاسی نظریات ہیں۔ یہ تنظیم بھٹو حکومت کے دور میں وجود میں آئی تھی۔ ضیاٗشاہی کے دور میں اس کا کوئی عمل دخل نہ تو سیاسی طور پر اور نہ ہی کسان مسائل کی جدوجہد کے حوالے سے نظر آتا تھا مگر پی پی حکومت کے قیام کے بعد وہ منظر عام پر آئی ہے اور حکومت خود اسے اہمیت دے کر دیگر ہاری تنظیموں سے زیادہ کسانوں اور کھاتیداروں کے لئے اہم بنانا چاہتی ہے۔ مگر اس کے گرد جمع ہونے والوں کا تعلق ماضی کی طرح اب بھی چھوٹے زمیندار ہی ہوں گے جو اس کے ذریعے اپنے انفرادی مفادات حاصل کریں گے اور اس بات کے امکانات بہت کم دکھائی دیتے ہیں کہ یہ تنظیم کسانوں اور چھوٹے کھاتے داروں کی وسیع تر تنظیم بن جائے۔

اپنے ہاری فرنٹ کا مختصر جائزہ تو ہم اوپر دے چکے ہیں اور اسے آج کی صورت حال میں تسلی بخش نہیں سمجھتے۔ اگر ہماری پارٹی بھی سائنسی عقل استعمال کرتی اور سائنسی طرز عمل اپناتی اور ہاری کمیٹی کو کسانوں کے اقتصادی و سیاسی مسائل پر بھی جدوجہد کرنے میں رہنمائی کرتی اور اس کی جدوجہد کو سیاسی، طبقاتی اور قومی مسائل سے تخلیقی انداز میں جوڑتی تو آج ہمارا کسانوں میں بہت بڑا تنظیمی اور سیاسی اثر ورسوخ ہوتا اور ہماری پوزیشن اتحادوں، سیاسی محاذوں اور تحریکوں میں بہت مضبوط ہوتی اور انقلابی راستے میں کسانوں اور چھوٹے کھاتے دار مضبوط قوت بن کر ہمارے ساتھ ہوتے اس دور میں پنو عاقل چھاؤنی کے خلاف ہاری کمیٹی کی جدوجہد بہت اہم رہی ہے مگر اس کے خلاف ہم کوئی سندھ بنیاد پر وسیع تر تحریک نہیں چلاسکے کیونکہ ہمارا کسانوں اور چھوٹے کھاتیداروں میں برائے نام کام تھا۔

سندھ کے موجودہ زرعی نظام کی معاشی، سماجی اور سیاسی صورت حال۔

سندھ دھرتی ۵۲۴۴۷ اسکوائر میلوں پر پھیلی ہوئی ہے۔ اس زرخیز علاقے کو ۱۶ ضلعوں اور ۴ ڈویژنوں کراچی، حیدرآباد، لاڑکانہ اور سکھر میں تقسیم کیا گیا ہے۔ کراچی ڈویژن کی تمام آبادی،

حیدرآباد، سکھر، لاڑکانہ اور نوابشاہ کی آبادی کے اکثریتی حصے کے گزر بسر کا دارومدار صنعتوں ملازمتوں، دکانداری، کاریگری اور بیوپار پر ہے۔ سندھ کو ۴۷ تحصیلوں، ۶۱ سب ڈویژنوں اور ۶۱۲ یونین کاؤنسلوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ ۲۶۹۲۳ گوٹھوں میں ۵۰ سے ۵ ہزار نفوس پر مشتمل آبادی ہے ان میں سے ۹۰ فیصد گوٹھ سندھی لوگوں پر مشتمل ہیں اور ان کی زندگی کا دارومدار زراعت پر ہے اور اسی طرح ۱۰۸ ٹاؤن کمیٹیوں کے رہواسیوں کا زیادہ تر گزر بسر زراعت سے وابستہ بیوپار، کاروبار پر ہے۔ دیہات کے صنعتی پراجیکٹ کے پراڈکٹ کا دارومدار بھی زراعت یا زمین سے یا حاصل شدہ معدنیات سے ہے۔ سندھ کی کل آبادی ۱۹۸۱ء کی مردم شماری کے مطابق ۹۷۸۶۰۰۰ نفوس تھی اور ۱۹۸۸ء اندازہ شدہ آبادی ۲۲۴۵۶۰۰۰ نفوس پر مشتمل ہے۔ یہ اضافہ پرانی آبادی میں تو تین فیصد سالانہ کے حساب سے ہوا مگر تین فیصد شرح پیدائش سے زیادہ سندھ کے اندر غیر سندھیوں کی نقل مکانی کی وجہ سے ہوا ہے۔ اور اب سندھی لوگوں کی شرح کا تناسب ۵۳ء۴ فیصد تک جا پہنچا ہے۔ کراچی اور حیدرآباد شہر کو چھوڑ کر دیہات اور دیگر شہروں کی آبادی ۱۱۱۲۴۰۰۰ ہے جس میں سندھیوں کا تناسب ۷۰ سے ۷۳ فیصد ہے، جبکہ حیدرآباد میں ۳۹ فیصد سے ۴۱ فیصد کراچی میں ۲۱ فیصد سے ۲۵ فیصد اور سکھر شہر میں ۴۶ فیصد سے ۴۸ فیصد سندھی لوگ ہیں۔ دیہاتی علاقوں میں بجلی کی سہولت ۲۷ فیصد اور صاف پانی کی سہولت ۱۸ فیصد لوگوں کو حاصل ہے۔ ۱۹۸۵ء کے اعداد و شمار کے مطابق دیہات میں پکے گھروں کی تعداد ۱۵۵۷۰۰۰ تھی اور تعلیم کی شرح ۱۷ فیصد تھی۔ ۱۹۸۸ء۔ ۱۹۸۷ء کے اعداد و شمار کے مطابق تعلیم کی شرح ۱۸ء۵ فیصد تھی۔ سندھ میں ۱۱۷۳۲ بوائز اور ۲۷۸۵ گرلز پرائمری اسکول کام کر رہے ہیں۔ جس میں سے دیہات میں بوائز اسکولوں کی کل تعداد کا آدھا اور گرلز اسکولوں کی کل تعداد کا ایک تہائی تھی۔ باقی اسکول کراچی، سکھر، حیدرآباد، نوابشاہ اور لاڑکانہ شہر میں ہیں۔ ۱۴۹۵ بوائز اور ۴۷۳ گرلز مڈل ہائی اسکول ہیں جن میں سے ۱۹۸۵ء۔ ۱۹۸۴ء کے اعداد و شمار کے مطابق دیہات میں ۹۰۷ بوائز اور ۱۵۱ گرلز مڈل و ہائی اسکول کام کر رہے تھے جن میں گذشتہ دو سالوں کے دوران ڈیڑھ فیصد سے دو فیصد اضافہ جو نیجو حکومت کی نئی روشنی اور مسجد اسکول پراجیکٹ کی وجہ سے ممکن ہوا۔ مگر ان کے محفوظ مستقبل کی کوئی آئینی ضمانت نہیں ہے۔ سندھ کے ۱۰۴ بوائز اور ۵۵ گرلز کالیجوں میں سے دیہات میں ۵۴ بوائز اور ۲۱ گرلز کالیج کام کر رہے ہیں۔ پروفیشنل کالیجوں میں دیہی علاقے کا کوٹہ ۶۰ فیصد ہے مگر عملی طور پر یہ کوٹہ ۳۵ فیصد سے بھی کم ہوتا ہے باقی کوٹہ جعلی لوگوں، غیر سندھیوں کو فراہم کیا جاتا ہے۔ ۱۹۸۷ء میں ۲۴۸ سول/ڈسٹرکٹ و تحصیل ہسپتال، محکموں و میونسپل کارپوریشنوں کے ہسپتال تھے۔ جبکہ ۵۷ رورل ہیلتھ سینٹر اور ۱۲۷ ڈسپنسریاں ریکارڈ پر موجود تھیں مگر عملی طور پر ڈسپنسریوں کی آدھی تعداد صرف ریکارڈ کی حد

تک ہے البتہ ۹۲ سب ہیلتھ سینٹر ۱۹۸۷ء میں تعمیر ہو رہے تھے۔ یہ تمام اعداد و شمار اس بات کی نشاندھی کرتے ہیں کہ سندھ کے دیہی علاقے کے اکثریتی عوام بجلی، صحت، رہائش اور صاف پانی جیسی بنیادی انسانی ضروریات سے محروم ہیں۔ سندھ میں ۱۷۷۶ کارخانے ہیں جن میں ۲۰۷۹۴۶ مستقل مزدور کام کرتے ہیں ان میں سے ۱۲۱۱ کارخانے کراچی میں ہیں اور ان میں ۱۵۱۷۵۱ مزدور کام کرتے ہیں جن میں سندھیوں کی تعداد ۵ فیصد سے زائد نہیں ہے۔ مذکورہ کارخانوں میں بڑے پراجیکٹوں کی تعداد ۳۴۵ ہے۔ ۳۹۵ صنعتی ادارے حیدرآباد سکھر اور کوٹری میں کام کر رہے ہیں اور باقی ۱۷۰ کارخانے سندھ کے دیہی علاقوں میں ہیں جن میں بڑے صنعتی پراجیکٹ ۱۹ ہیں۔ (نوری آباد صنعتی فیلڈ کے اعداد و شمار کی تصدیق نہیں ہو سکی)

سندھ کی کل زمین ۸۱ لاکھ ۸۲ ہزار ایکڑ (جو کہ ۱۹۶۲۰۰۸۰ ہیکٹر بنتی ہے) ہے، میں سے ۲۳۶۲۰۰۰ ہیکٹر رقبہ بیراج کے پانی پر آباد ہوتا ہے جبکہ ۴۹۲۰۰۰۰ ہزار رقبہ برسات کے رحم و کرم پر ہے مگر برسات پڑنے کے باوجود بھی اس رقبہ کا صرف ۱۵ فیصد کاشت کے لائق ہوتا ہے باقی زمین غیر آباد رہتی ہے۔

۲۷۱۱۴ ٹریکٹروں میں سے ۶۸ فیصد ٹریکٹر زراعت کے لئے استعمال ہو رہے ہیں۔ ۱۳۲۱۵ تھریشر زرعی پیداوار کے ضمن میں کام کر رہے ہیں۔ ۵۱۱۹ کلومیٹر پکی روڈ اور ۴۴۴۱ کلومیٹر کچی روڈ شہری اور دیہاتی علاقے میں موجود ہے۔ ۱۰۰ سے ۱۲۵ تک وہ بڑے زمیندار ہیں جن کی زمین ۵۰۰۰ ایکڑ سے ایک لاکھ ایکڑ تک پھیلی ہوئی ہے اور وہ اپنے علاقوں میں مضبوط زمینداری روایتوں کے حامی ہیں اور ہر آنے والی حکومت کا سلام بھرتے ہیں۔ ان کا اپنے کسانوں اور قبیلہ والوں کے ساتھ گھٹیا اور ظالمانہ برتاؤ ہے۔ بے زمین ہاریوں کا تناسب ۱۹۸۶ء-۱۹۸۵ء میں ۲۹ فیصد ایک ایکڑ سے ۲۵ ایکڑ کے مالکان کا تناسب ۴۲ فیصد اور ۲۶ سے ۱۰۰ ایکڑ تک کے کھاتے داروں کا تناسب ۱۷ فیصد اور ۱۰۰ سے ۱۰۰۰ ایکڑ تک کے کھاتے داروں کا تناسب ۶۰ فیصد تھا۔ جس میں گذشتہ دو سالوں کے دوران بے زمین کسانوں کے ضمن میں ایک فیصد کمی اور ۱۰۰ فیصد ایکڑ تک کے مالکان کے تناسب میں ڈیڑھ فیصد اضافہ ہوا ہے۔ ان اعداد و شمار میں پنجابی فوجیوں اور ریٹائرڈ آفیسروں کو خاص اسکیموں کے تحت دی گئی زمین شامل نہیں کی گئی ہے۔ سندھ میں مشینی کھیتی باڑی نے اتنی ترقی نہیں کی کہ کسانوں کی بڑے پیمانہ پر بے دخلی ہو۔ پیداوار میں کمی کے اسباب میں ایک سبب یہ بھی ہے کہ زمینداروں نے ٹریکٹر وغیرہ خریدنے کے بعد زراعت کے ضمن میں کم استعمال کیا ہے تاہم سندھ کے اندر کچھ علاقوں میں کمیت مزدور پیدا ہوا ہے جو زمینداروں کے زرعی فارموں میں کام کرتا ہے مگر اس کی تعداد سینکڑوں سے زائد نہیں ہے۔ زرعی ٹیکنالوجی مہنگی ہونے کی وجہ سے پیداوار اور خرچ کا تناسب قریباً ایک جیسا ہو گیا ہے۔ کسانوں اور چھوٹے

کھاتے داروں کے پاس بچت میں کچھ بھی نہیں اور ان کی معاشی حالت بد تر ہے۔ پیداواری یونٹوں کی پیداوار میں کمی میں سیم و تھور کا عنصر بھی اثر انداز ہو رہا ہے۔ ہر سال ۳۲ سے ۳۹ ہزار رقبہ سیم و تھور کا شکار ہو کر اپنی زرخیزی کھو رہا ہے۔ حالانکہ اس کو روکنے کیلئے آٹھ اضلاع میں ۱۷۵۰۰ ٹیوب ویل لگائے گئے ہیں مگر وہ صحیح طریقہ پر کام نہیں کرتے۔ نکاسی کا بندوبست سائنسی بنیادوں پر نہیں اس وجہ سے سیم و تھور کی روک تھام مناسب انداز میں نہیں ہو رہی۔ سندھ کا آبادگار اور کسان جو دور رہا مگر بڑے بڑے زمیندار اپنی زرعی اجناس کی قیمتیں مقرر کرنے میں ایک پیسہ جتنا بھی اختیار نہیں رکھتے اور نہ ہی اپنے طور پر بین الاقوامی منڈی میں برآمد درآمد کرنے کی اجازت ہے۔ یہاں کا زرعی نظام امریکی سامراج، پنجابی بالادستی اور مہاجر پنجابی سرمایہ داروں اور افسر شاہی کے رحم و کرم پر ہے جس نے بیوپاریوں، ڈیلروں اور کمشن ایجنٹوں کی بھی ایک اچھی خاصی تعداد پیدا کرلی ہے۔ سندھ کے زرعی سماج میں مشینی کاشت کار شتہ ابھی مضبوط جگہ نہیں سنبھال سکا ہے۔ زمینداری اور جاگیرداری اور قبائلی باقیات کافی اثر و رسوخ رکھتی ہیں۔ سماجی رسم و رواج میں سرمایہ دارانہ ثقافت نے ابھی پاؤں ہی لگائے ہیں۔ بھی ان علاقوں میں جو شہروں کے قریب ہیں یا وہاں ٹی وی وغیرہ کی سہولت پہنچی ہے۔ جاگیردارانہ، زمیندارانہ ثقافتی رسمیں ابھی کافی مضبوط ہیں مگر ان میں دراڑ پیدا ہو چکی ہے۔ پیپلز پارٹی کی موجودہ حکومت اگر سابقہ بھٹو حکومت کی طرح زراعت میں جدید ٹیکنالوجی کو وسیع بنیادوں پر متعارف کرانے کی پالیسی اپنائے گی ابھرتا ہوا بورژوازی زمینداروں سے پیدا کرے گی اور بے زمین کسانوں کی تعداد کم کرے گی، دیہات میں سماجی ترقی ہوگی تو پھر ہماری جدوجہد کے لئے نیا میدان کھلے گا جس کی منصوبہ بندی آج کی صورتحال کو سامنے رکھ کر کی جائیگی۔ ہماری نظر میں ہاری کمیٹی کو صرف ہاریوں کی تنظیم نہ بنایا جائے بلکہ ایسے کسانوں، کھاتے داروں اور چھوٹے زمینداروں کی مشترکہ تنظیم کی شکل دی جائے اور تخلیقی انداز سے حکمت عملی بنا کر جدوجہد کی جائے تاکہ ایک وسیع منظم اور باعمل کسان تحریک جوڑی جاسکے۔ اس کی بنیاد مندرجہ ذیل ہوسکتے ہیں۔

ہماری جدوجہد کی آج اور مستقبل کی حکمت عملی کی بنیاد

۱۔ سندھ ٹیننسی ایکٹ، ایوب خان اور بھٹو کی زرعی اصلاحات پر عمل کرانا، مزید بہتر اصلاحات نافذ کرانا اور ۱۹۷۲ء کے بعد سے زرعی اصلاحات کے زد میں آنے والی زمین پر قابض زمینداروں سے ۱۹۷۲ء سے لے کر اس وقت تک کا حساب لینا اور زمین ضبط کرانا۔

۲۔ زرعی اجناس کی قیمتوں میں ۳۰ سے ۵۰ فیصد اضافہ کرانا۔

۳۔ زرعی ٹیکنالوجی جس میں یوریا اور زرعی ادویات بھی آتی ہیں، کی قیمتوں میں ۵۰ فیصد کمی کرانا خاص طور پر گورنمنٹ ٹیکس معاف کرانا۔

۴۔ غیر سندھیوں کو الاٹ کی گئی زمین کو رد کرا کر بے زمین کسانوں اور چھوٹے کاشتکاروں میں تقسیم کرانا۔

۵۔ دیہاتی علاقوں میں زراعت سے وابستہ صنعتیں لگانا اور ان میں سندھی دیہاتیوں کو روزگار دلانا۔

۶۔ ریوینیو کھاتہ، افسر شاہی، پولیس اور زمینداری ظلم کو ختم کرانا۔

۷۔ زمینداروں کو جھوٹے ناموں پر الاٹ کی گئی زمین کی تحقیقات کرانا اور بچی ہوئی سرکاری زمین حقدار کسانوں اور چھوٹے کھاتیداروں کو الاٹ کرانا۔

۸۔ زرعی اجناس کی قیمتیں مقرر کرنے والی سرکاری کمیٹیوں میں سندھ کے کسانوں، کھاتیداروں اور زمینداروں کو شامل کرانا اور غیر ملکی ایکسپورٹ فرموں سے براہ راست بیوپاری تعلقات قائم کرانے کی اجازت دلوانا۔

۹۔ عشر کا مکمل خاتمہ، بارہ ایکڑ تک آبیانہ معاف کرانا اور پکی گرانٹ پر پنجاب کی طرح زرعی قرض دلوانا۔

۱۰۔ کسانوں اور کھاتیداروں کی فلاح و بہبود کے لئے کوآپریٹو سوسائٹیاں قائم کرانا، مشینی کھیتی باڑی کی ترقی کرنے کے لئے تحقیقی مرکز کھلوانا، موجودہ زرعی فارموں کی کارکردگی کو بہتر بنوانا اور کسانوں، کھاتیداروں اور چھوٹے زمینداروں کو جدید ٹیکنالوجی سے واقف کرنے کے لئے پروگرام بنانا۔

۱۱۔ دیہاتی علاقوں میں بجلی، روڈ، اسپتال اور اسکول کھلوانا۔

۱۲۔ سندھ کی زمین کو غیر آباد کرنے والی سازشوں کو ناکام بنانا۔

۱۳۔ بیدخل ہونے والے کسانوں اور زراعت سے وابستہ لوگوں کی فارغ التحصیل اولاد کو روزگار دلوانا۔

۱۴۔ دیہات اور شہری علاقوں میں سندھیوں کو اقلیت میں تبدیل کرنے والی سازش کو ناکام بنانا، شہری اور دیہی علاقوں میں بیگانگی کی خلیج کو کم کرنا۔

یہ وہ معاشی و سیاسی بنیاد ہے جس کو ابھار کر وسیع تر ہاری کھاتے دار تنظیم بنائی جاسکتی ہے اور کچھ مطالبوں کو مرکزی حیثیت دے کر تحریک بھی چلائی جاسکتی ہے۔ جس طرح معاشی تضادات کی جدوجہد کو قومی اور جمہوری جدوجہد کے ساتھ جوڑا جاسکے۔ مگر اولیت معاشی مسئلوں کو دینی ہوگی۔ مگر ایک بار پھر ہاری کمیٹی کو پارٹی کے اوپن سیاسی پلیٹ فارم کے طور پر استعمال کیا

گیا تو ہم انقلابی کاز کو نقصان پہنچائیں گے اور محنت کش عوام کی پارٹی اپنے وفادار اتحادی کسان اور چھوٹے کھاتیدار کو اپنے ساتھ نہیں جوڑ سکے گی۔ وہ دوست جو کہتے ہیں علیحدہ ہاری فرنٹ کی کوئی ضرورت نہیں ہے وہ معاشی تضادات کو اور مندرجہ بالا بحث کو سمجھنے کی کوشش کریں۔ ماضی میں ہاری کمیٹی کے فعال نہ ہونے اور وسیع منظم تحریک کا وجود میں نہ آنے کا ذکر کر لیا گیا اسباب اور پالیسیوں پر غور کریں تو ان کی سمجھ میں آجائیگا کہ ہاری فرنٹ کا ہونا ضروری ہے۔ سیاسی پارٹی سندھ یا ملک کے تمام محنت کش عوام کا محب وطن طبقات یا گروہوں کے اہم سیاسی مسائل اور آج کے اہم تضاد، قومی تضاد کو حل کرانے کی جدوجہد کرے گی۔ اس کی سیاسی قومی اور جمہوری جدوجہد کثیر بنیادوں پر ہوگی جبکہ ہاری کمیٹی فرنٹ کسانوں اور کھاتے داروں کے معاشی طبقاتی اور جمہوری حقوق کے لئے ٹریڈ یونین بنیادوں پر جدوجہد کرے گا اور اس کی جدوجہد کے ذریعہ محنت کش عوام کی پارٹی کے لئے سیاسی ہمدردی کا ایک بہت بڑا میدان تیار کیا جاسکتا ہے۔ اس کے لئے کسان راہنماؤں کو اہم کردار ادا کرنا پڑے گا۔ ان میں معاشی جدوجہد کے اوصاف پیدا کرنا ہوں گے۔ ہاری مسائل کی قانونی بنیاد کو سمجھنا ہوگا۔ چھوٹے کھاتے داروں اور کسانوں کے درمیان اتحاد اور مشترکہ جدوجہد کے لئے سازگار فضا پیدا کرنی ہوگی اور ان کی سیاسی تربیت جدوجہد سے سامنے آنے والے نتائج کی روشنی میں کرنی پڑیگی۔

اس ساری بحث کے بعد ہم اس نتیجہ پر پہنچے ہیں کہ سندھ کے کسانوں، کھاتیداروں اور چھوٹے زمینداروں کو منظم، متحرک اور متحد کرنے کے لئے ایک فعال ہاری فرنٹ کی سخت ترین ضرورت ہے۔ اس کی جدوجہد سے حکومت، افسر شاہی، پنجابی بالادستی، مہاجر سرمایہ دار مفادات اور سامراج کے اشارے پر بنائی گئی طفیلی زرعی پالیسی سے ٹکراؤ ناگزیر ہو جائے گا اور ان کے قومی اور سیاسی شعور کی ترقی ہوگی۔ وہ اپنے عمل میں سیاسی، جمہوری اور قومی جدوجہد کو اپنی جدوجہد سمجھنے لگیں گے اور قومی جمہوری راستہ کے ذریعے انقلابی تبدیلی لانے میں محنت کش عوام کی پارٹی کے بہترین اور بنیادی وفادار جنگجو ساتھی اور اہم قوتوں میں سے ایک ہو سکیں گے۔

(سجن بھٹو سندھ ہاری کمیٹی کے جنرل سیکریٹری ہیں)

پختونخواہ کا قومی مسئلہ۔ ایک مختصر جائزہ

سید ضیأ اللہ شاہ

پختونخواہ کا قومی سوال اپنی تاریخی اور مخصوص ثقافتی، تہذیبی اور معاشی اعتبار سے منفرد خصوصیات کا حامل ہے۔ یہ خصوصیات اور عوامل پاکستان میں رہتے ہوئے دوسرے صوبوں میں موجود قوموں یا قومیتوں سے بالکل جداگانہ حیثیت رکھتے ہیں۔ پختون خواہ قبیلوں کی شکل میں تھے یا قومیتوں اور قوم کی شکل میں، اپنے ہر حیاتیاتی دور میں ظلم اور استبداد کے خلاف سینہ سپر رہتے چلے آ رہے ہیں۔ یہ پختون ہی تھے جنہوں نے یونانی استبداد کے خلاف جدوجہد کی اور خلیفہ معاویہ کے دور میں حملہ آور عربی جرنیل مہلب بن ابی صفرہ کو موضع نبو اور لاہور میں شکست فاش دی۔ اسی طرح سولہویں اور سترہویں صدی میں پختونوں کی تاریخ مغل بادشاہوں کے خلاف منظم جدوجہد سے بھری پڑی ہے۔ یہی وہ دور تھا جس میں مذہبی روشن فکر تحریک بایزید (پیر روشن) کی سرکردگی میں بادشاہ اکبر کے خلاف منظم ہوئی، پیر روشن نے افغانوں کو پہلی بار منظم اور اکھٹا کیا۔ افغانوں کو تنگ نظری اور بے جا عقیدہ پرستی سے نجات دلائی۔ آپ کا قول تھا کہ تزکیۂ نفس اور زندگی کے مسائل کے حل کے لئے پیرو مرشد ضروری ہوتا ہے مگر اس کے لئے لازم ہے کہ وہ امیر طبقوں اور بادشاہوں کا مخالف ہو۔ آپ دولت، امارت اور بادشاہت کے خلاف تھے۔ اور آپ کا آخری شاگرد جب تک زندہ تھا مغل بادشاہ آرام کی نیند سو نہیں سکے تھے۔ بایزید کے علاوہ مغل بادشاہ اورنگ زیب کے خلاف خوشحال خان، دریا خان اور اجمل خان میدان میں کود پڑے

اسی طرح سکھوں کے حملہ آور ہونے پر یہاں کے پختون برہم ہو گئے اور مقابلہ پر اتر آئے۔

پشتون خواہ آزاد قبائلی علاقوں میں ہوں، بلوچستان میں ہوں، شمالی اور جنوبی وزیرستان میں ہوں، سرحد میں ہوں یا افغانستان میں تاریخی اعتبار سے ایک ہی شجر کے بیج، ایک ہی کلچر اور ثقافت کی پیداوار ہیں۔ مگر بد قسمتی یہ ہے کہ اتنی طویل جدوجہد اور بہادریوں کے باوجود تاریخ کے ہر دور میں پختونوں کو اپنے تشخص اور ثقافت سے بیگانہ بنایا گیا۔ پیر روشن کی تحریک نے جب زور پکڑا اور مغل بادشاہوں کی مسند جب خطرے میں پڑ گئی تو مغلوں نے اس تحریک کو کچلنے کے لئے سید علی اور اخون درویزہ کو بھیجا۔ انہوں نے تحریک کی مذہبی انداز میں مخالفت شروع کی اور بایزید کو ملحد بنا کر پیر روشن کے بجائے پیر تاریکی کا نام لکھا۔ اور آج اس پروپیگنڈہ کا یہ اثر ہے کہ سید علی کو لوگ پیر بابا کی شکل میں جانتے ہیں اور پیر روشن کا کہیں نام و نشان نہیں۔ پختونوں کی تاریخ پڑھنے سے پتہ چلتا ہے کہ مغلوں سے لے کر انگریزوں کے آنے تک اور اس کے بعد پاکستان بننے کے بعد تک اس سارے دور میں پختونوں کا تشخص اور کلچر دبتا چلا آ رہا ہے۔ کلچر کی محرومی سے ہٹ کر جب پختون سوسائٹی کے اقتصادی رشتوں کی طرف جاتے ہیں اور تاریخی اعتبار سے اس کا مطالعہ کرتے ہیں تو دیکھتے ہیں کہ اشیأ کے تبادلے اور اقتصادی رشتوں کے رفتہ رفتہ بڑھنے اور مضبوط ہونے سے بہت سی نسلیں اور پختون قبیلے قومیتوں کی شکل میں ماضی میں بدل گئے تھے۔ قومیتوں کے بعد پختون قوم کا سوال آتا ہے۔ جو کہ کافی غور طلب ہے۔ مارکس کے مطابق قوم انسانوں کا ایک ایسا پائیدار اجتماع ہوتا ہے اور تاریخی اعتبار سے ایسی کمیونٹی ہوتی ہے جس کا مشترکہ علاقہ، مشترکہ زبان اور مشترکہ نفسیاتی ساخت یعنی کلچر ہوتا ہے۔ جب سماج اس دور تک پہنچتا ہے تو ضروری ہے کہ سرمایہ داری اس دور تک پہنچ چکی ہو گی۔ جب سرمایہ داری اپنی ارتقائی منازل طے کرنے لگتی ہے۔ تو تجارتی رشتے اقتصادیات کی فکری شکل پر ضرب لگاتے ہیں۔ سرمایہ داری اپنی جغرافیائی حدود میں نئے پیداواری رشتے قائم کرنے لگتی ہے۔ مارکیٹ اور منڈیاں بننے لگتی ہیں، مزدور طبقہ بیدار ہو کر بڑھتا ہے اور قومیتیں ایک دوسرے کے قریب آ کر قوم میں بدل جاتی ہیں۔ اس سلسلے میں اگر دیکھا جائے تو جنگ عظیم اول سے قبل جب برطانیہ ایک ہی وقت میں ریاست اور قوم کی شکل میں نمودار ہوئی تو برطانیہ کے اندر سرمایہ دارانہ طرز پیداوار اپنی ارتقائی منازل طے کر چکی تھی اور اپنی منڈی کو مزید وسعت دینے کے لئے وسط ایشیا کا رخ کر گئی۔ اس لئے ۱۸۴۹ء میں برصغیر پر حملہ آور ہو کر انگریزوں نے رنجیت سنگھ کے علاقوں پر قبضہ کیا اور اس کے ساتھ سندھ کے کنارے تک افغانستان کے مشرقی علاقوں کو قبضے میں لا کر پختونخواہ میں سرمایہ دارانہ نظام کا انتقال کر کے اس علاقے کو نوآبادیات میں بدل ڈالا۔

پختونخواہ میں سرمایہ داری کی آمد نے یہاں کے طرز پیداوار MODE OF

PRODUCTION کو جوں کا توں رہنے دیا۔ اس لئے پیداواری رشتے پرانے رہ گئے۔ نوآبادیاتی نظام کو مضبوط بنانے کے لئے انتظامیہ کو سخت سے سخت بنایا گیا۔ انگریزوں نے بڑی ہوشیاری کے ساتھ پختونوں کے کلچر اور تشخص کو برباد کیا۔ پختونوں کی جغرافیائی تقسیم عمل میں لائی گئی۔ وہ اس طرح کہ، جنوبی پختونخواہ کو بلوچستان کا حصہ بنایا گیا حالانکہ بلوچی کلچر اور تاریخ کے اعتبار سے پختونوں سے بہت مختلف ہیں اسی طرح زبان بھی مشترک نہیں ہے۔ شمالی اور جنوبی وزیرستان کو آپس میں جدا کیا گیا۔ افغانستان کے مشرقی حصوں کو ڈیورنڈ لائن کی فرضی لکیر سے جدا کر کے قبیلے، یہاں تک کہ ایک ہی خاندان کے افراد بانٹے گئے۔ اور ان حصوں کا نام شمالی مغربی سرحدی صوبہ رکھا گیا۔ سرمایہ داری کا وہ ترقی پسند رجحان جو اس کو جاگیرداری کے مقابلے میں حاصل ہوتا ہے۔ پختونخواہ میں سرمایہ کے نہ پہنچنے کی وجہ سے حاصل نہ ہوسکا۔ اس کے مقابلے میں یہ علاقہ انگریزی حکومت میں ایشیا کو صرف فروخت کی منڈی اور خام مال کے حصول کا ذریعہ بنایا گیا۔ اس لئے ایک طرف جغرافیائی تقسیم کی وجہ سے اور دوسری طرف اقتصادی میدان میں پختون قوم اس معیار سے بہت پیچھے رہ گئی جو اس کو سرمایہ داری نظام کے بدلے حاصل کرنی تھی۔

انگریزوں کی آمد اور ان کے برسر اقتدار رہنے کے بعد پختونخواہ میں نوآبادیاتی نظام کے خلاف ایک طویل اور سخت قسم کی تحریک جو قومی آزادی کی تحریک تھی۔ چلائی گئی، معاشی نقطہ نظر سے یہ تحریک ایسی تھی جس میں پختون بورژوازی کا حصہ نہ ہونے کے برابر تھا۔ تحریک کو نچلے حلقوں کی حمایت حاصل تھی۔ اور پختونخواہ کے مظلوم لوگوں کی اکثریت اس میں شامل تھی۔ خدائی خدمت گار تحریک کی شکل میں پختونخواہ کے پسے ہوئے عوام نے بڑی قربانیاں دیں یہاں تک کہ ۱۹۴۷ء میں ریفرنڈم کے وقت پختونخواہ کی اکثریت ریفرنڈم سے الگ رہی۔ انگریزوں کے خلاف جدوجہد میں یہ تحریک کانگریس کے ساتھ شامل تھی۔ کانگریس میں ہندو بورژوازی مضبوط تھی۔ اور تحریک میں اس کا بڑا اہم رول تھا۔ اس کے برخلاف مسلم لیگ تحریک جو کہ مہاجر اور پنجابی بورژوازی نے منظم اور متحد کی تھی، کانگریس کے خلاف دوقومی نظریہ کے تحت تحریک چلا رہی تھی۔ مسلم لیگ بالاآخر انگریزی وائسرائے پر اثر انداز ہوگئی اور مسلم کثیر القومی نظریہ کو یک قومی نظریہ میں بدلنے اور پاکستان بنانے میں کامیاب ہو گئی اور پختون اپنی الگ حیثیت منوانے کے بجائے مہاجر اور پنجابی بورژوازی کی پیدا کردہ تجازبی گڑھے میں گر پڑی۔

پاکستان کی بورژوازی کا بڑا حصہ ان مسلمان کمرشل خاندانوں اور نسلوں پر مشتمل ہے جو پاکستان سے پہلے ہندوستان میں آباد تھے۔ اس میں مسلم، خواجہ، میمن، بوہرا خاندان شامل تھے اسی طرح پنجاب کے کمرشل خاندان شمسی، چنیوٹی، شیخ وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ پاکستان بننے کے وقت ان خاندانوں نے یہاں کا رخ کیا اور پنجاب کے سرمایہ داروں کے ساتھ مل کر ۱۹۷۱ء تک

پاکستان کی مارکیٹ پر بالا دستی قائم کی۔ یہ خاندان قومی اجارہ دار بورژوازی کے مرکزی عناصر بن گئے۔ تحریک پاکستان میں ان کا اہم رول تھا۔ میمن کمیونٹی کے لیڈر پاکستان کی ابھرتی ہوئی بورژوازی میں سب سے زیادہ طاقتور جانے جاتے ہیں۔ پاکستان کی صنعت اور فنانس کا بڑا حصہ ان کے زیر اثر ہے۔ بڑی بڑی معروف شخصیات اس خاندان سے تعلق رکھتی ہیں۔ ان خاندانوں نے سمندری ساحل کے کنارے آباد شہر کراچی میں صنعتیں لگانی شروع کیں۔ صنعتی اعتبار سے کراچی سب سے زیادہ صنعت یافتہ شہر ہے۔ کراچی میں پٹرولیم، دھات اور کپڑا بننے کے کارخانے، چمڑے اور بوٹ وغیرہ کے کارخانے قائم ہیں۔ پٹرولیم کے کارخانوں کو چھوڑ کر باقی تمام میں پنجاب نے سبقت حاصل کی ہے۔ دھات کی مصنوعات، مشینری الیکٹریکل اور نان الیکٹریکل میں پنجاب ملک میں سب سے بڑا صنعت یافتہ علاقہ ہے۔ ۱۹۸۰-۱۹۸۱ء تک کے صنعتی اعداد و شمار سے پتہ چلتا ہے کہ مہاجر خاندانوں کے ساتھ ساتھ پنجاب کے صنعتی بورژوازی کافی مضبوط ہو گئی ہے۔ نہ صرف صنعت میں بلکہ زراعت، تعلیم، فوجی اور سول بیورو کریسی تمام شعبوں میں پنجاب آگے نکل رہا ہے۔ ان اعداد کے مطالعہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ کراچی کو منہا کر کے باقی تمام سندھ معیار زندگی کے لحاظ سے پنجاب سے پست ہے۔ بلوچستان آخری درجے پر ہے اور سرحد کی حالت بلوچستان اور سندھ دونوں کی نسبت کئی صورتوں میں بہتر ہوتی چلی آ رہی ہے۔

جناب اکبر زیدی کے مقالے "پاکستان میں علاقائی نا برابریاں اور قومی سوال" کے مطابق ۱۹۶۰ء کے وسط میں سبز انقلاب نے پرانے جاگیرداری اور قبل از جاگیرداری ڈھانچوں کو توڑا اور سرمایہ دارانہ پیداواری رشتے ظہور میں آ گئے۔ اس اثر سے صوبہ سرحد میں ۶۳ فیصد غریب کسان، ۷۵ فیصد لوگوں کے پاس ۵ء۱۲ ایکڑ زمین اور ۲۵ فیصد SHARE CROPPERS ہیں جبکہ ۱۲ فیصد سرمایہ دار زمین دار ہیں۔ ۱۹۸۰ء میں پنجاب میں زمین قابل کاشت زمین ملک کا ۴ء۵۶ فیصد تھی اور صوبہ میں ملک کے ۸۴ فیصد ٹریکٹر استعمال ہوتے تھے۔ جبکہ سرحد میں ۴ء۹ فیصد قابل کاشت زمین پر ۵ فیصد ملک کے ٹریکٹروں کا استعمال تھا۔ پنجاب میں ۸۲ فیصد ٹریکٹر اور پاور بلیڈ کا استعمال ہے جبکہ سرحد میں صرف ۳ فیصد۔ پنجاب میں ۶۸ فیصد فرٹیلائزر استعمال ہوتا ہے جبکہ سرحد میں ۶ فیصد۔ پودوں کی حفاظت کا مجموعی علاقہ ۶۰ فیصد پنجاب میں اور ۴ فیصد سرحد میں موجود ہے۔ ان اعداد و شمار سے پتہ چلتا ہے کہ زرعی پیداواری تعلقات نے پنجاب میں بہت ترقی کی ہے جس کی وجہ سے پنجاب دوسرے صوبوں سے سماجی اور اقتصادی لحاظ سے آگے نکل گیا ہے اور سیاسی میدان میں اس کا اثر چھوٹے صوبوں پر پڑا ہے۔ اسی مقالے کی رپورٹ کے مطابق پنجاب میں کپاس کے مرکزی اضلاع ملتان جس کی پیداوار ۱۷ فیصد رحیم یار خاں، جس کی پیداوار ۱۲ فیصد، وہاڑی کی پیداوار ۸ فیصد، بہاولپور کی ۶ فیصد ساہیوال کی ۴ فیصد۔ اسی طرح پنجاب کی

مجموعی کپاس کی پیداوار ملک کا ۵۰ فیصد ہے۔ جس کی وجہ سے فیصل آباد، ملتان، حیدرآباد اور کراچی کے ساتھ ساتھ ٹیکسٹائل صنعت کے مراکز بن گئے ہیں۔ گنے کی پیداوار پشاور ضلع ۷ فیصد ملکی سطح پر ہے جس کے اثر سے ۱۳ شوگر مل چل رہی ہیں۔ اسی طرح مردان کی شوگر مل بھی ہے۔ مردان اور پشاور کے علاقے تمباکو پیدا کرتے ہیں جن میں کئی تمباکو کی فیکٹریاں چلتی ہیں۔
بڑے پیمانے پر صنعتوں میں آل انڈسٹری میں ۸۱-۱۹۸۰ء تک صوبہ سرحد میں ۱۶۴ کارخانے تھے، انہی سالوں میں چمڑے اور بوٹ وغیرہ کی مقدار ۵ دھات کی بنیادی صنعت ایک فوڈ مینو فیکچرنگ، ۳۱ کیمیکل ۱۵ الیکٹرک مشنری ۳ ٹیکسٹائل ۶۰ کوئلہ اور پٹرول ایک فیبریکیٹیڈ تھے۔
۱۹۷۶ء اور ۸۴-۱۹۸۳ء کے سالوں کے درمیان گھریلو اور چھوٹے پیمانے کی صنعتوں کی شرح میں اضافہ ہوا ہے۔ یہ شرح پنجاب میں ۱۲۳ فیصد سندھ میں ۱۰۹ فیصد بلوچستان میں ۹۹ فیصد اور صوبہ سرحد میں ۲۰۸ فیصد بڑھی ہے۔ سرحد میں اس زیادہ شرح کی وجہ صوبے کے اندر اور صوبے سے باہر بیرونی ممالک کو روزگار کے سلسلے میں نقل مکانی ہے۔ مشرق وسطیٰ سے بھیجی ہوئی رقوم، اسی طرح ۱۹۸۰ء سے افغان مہاجرین کو ملنے والی بیرونی امداد سے نکالی گئی رقوم سرحد کی اضافی آمدنی کا موجب بنتی ہیں اس طرح اسمگلنگ اور ہیروئن سے کمائی ہوئی رقوم بھی صوبے کی مادی حیثیت کو بڑھاتی ہیں۔
اس بحث سے دو ادوار واضح ہو جاتے ہیں۔ ایک دور جس میں صوبہ سرحد اور بلوچستان میں پختونوں کی جغرافیائی تقسیم اور ان کے کلچر اور تشخص کے دبانے کا عمل جاری تھا اور جس نے پختونوں کے حق خود ارادیت کو نقصان پہنچایا اور دوسرا دور وہ جو پاکستان بننے کے بعد آہستہ آہستہ شروع ہوا۔ اس دور میں سرحد میں پختونوں کی قومی بورژوازی مضبوط ہو گئی۔ آج صوبے میں اپنی بیوروکریسی ہے اور ملکی سطح پر پختون بیوروکریسی کی تعداد ۱۱ فیصد ہے۔ جبکہ پنجاب کا حصہ ۵۶ فیصد ہے اسی طرح درمیانے درجے اور سینیئر سول پوسٹوں کی تعداد میں صوبہ سرحد کا ملکی سطح پر ۶ فیصد حصہ ہے اور پنجاب کا ۴۱ فیصد ہے۔ آرمی میں سرحد کا حصہ ۱۰ سے لے کر ۱۲ فیصد اور پنجاب کا ۸۵ فیصد ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ پختونوں کی سرحد میں بورژوازی زیادہ تر صنعت کو کنٹرول کرتی ہے۔ اور صارفین کی سطح پر پنجاب کا رول پختونخواہ میں کم کر دیا گیا اور مارکیٹ میں اب پختونوں نے پنجابیوں کی جگہ لے لی ہے۔ یہاں زراعت میں سرمایہ داری آ رہی ہے۔ جس سے زرعی مزدور آزاد ہو رہا ہے جو کہ روزگار کی تلاش میں شہروں کا رخ کرتا جا رہا ہے۔ مگر صوبہ سرحد میں زراعت میں سرمایہ کی ترویج اس نسبت سے نہیں ہو رہی ہے جس نسبت سے پنجاب میں ہو رہی ہے یا ہو چکی ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ بڑھتی ہوئی آبادی کے رجحان اور زرعی کھادوں اور بیجوں کی قیمتوں کے بڑھنے اور عام افراط زر کے مسائل کو بھی زیر نظر رکھنا چاہیئے۔ افراط زر کی

وجہ سے اشیائے صرف کی قیمتیں دگنی اور چوگنی ہو رہی ہیں جس کا اثر یہ ہے کہ نچلے اور درمیانے طبقے کا زمیندار اپنی زمینوں کی تمام پیداواری صلاحیتوں سے پیدا شدہ معاشی بحران سے دوچار ہو کر تنگ آ گیا ہے۔ اور زمینوں کی کاشت کو چھوڑ رہا ہے۔ یہ بات بھی ذہن نشین رکھنی چاہیئے کہ زمین کی مقدار معین ہے بلکہ بڑھتی ہوئی آبادی کی وجہ سے کم ہوتی جا رہی ہے جبکہ بنجر زمینوں کو قابل کاشت بنانے کا عمل نہایت سست ہے۔ لہٰذا آئندہ مستقبل صوبہ میں چھوٹے پیمانے پر صنعت کاری کا ہے۔ اس لئے موجودہ اور آئندہ جائزوں سے یہ نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے کہ پختونخواہ میں پرانے پیداواری رشتے بدل کر نئے پیداواری رشتے جو کہ سرمایہ دارانہ طرز کے ہیں پروان چڑھتے جا رہے ہیں اور یہی موڑ ہے جہاں طبقاتی تضاد بڑھ کر قوم کو حکومت کی طرف لے جاتا ہے۔ اور قومی بورژوازی کا رول بڑھتا جا رہا ہے۔ اعداد و شمار سے ظاہر ہے کہ معاشی میدان میں پنجاب کی بالادستی قائم ہے اور مزید رہے گی۔ اس لحاظ سے قومی سوال زیادہ شدت اختیار کرتا جائے گا۔

(ضیاُاللہ شاہ صوبہ پختونخواہ کے نوجوان دانشور ہیں اور خود ایڈووکیٹ ہیں)

ذہانت۔ ایک الجھا ہوا موضوع

رفیق جعفر

علم نفسیات کے حوالے سے ذہانت کے موضوع کا مطالعہ ہمیں کئی پیچیدہ قسم کے سوالات سے دوچار کرتا ہے۔ مثلاً سب سے پہلے تو یہ سوال کہ ذہانت کیا ہے؟ ماہرین نفسیات تقریباً سو سال سے کروڑوں افراد کی ذہنی آزمائش کر چکے ہیں۔ لیکن وہ اس بات پر متفق نہیں ہیں کہ ذہانت کیا ہے۔ یہ مسئلہ نیا نہیں ہے۔ ۱۹۲۱ء میں ۱۷ مشہور امریکی ماہرین نفسیات سے پوچھا گیا کہ ان کے نزدیک ذہانت کیا ہے؟ اس سوال کے جواب میں ذہانت کی ۱۷ مختلف تعریفیں بیان کی گئیں۔ ۱۹۲۳ء میں امریکی ماہر نفسیات ایڈورڈ بورنگ نے ذہانت کی یوں تعریف کی کہ۔ "ذہانت وہی کچھ ہے جو کہ ایک ذہانت کی آزمائش پیمائش کرتی ہے۔" حالات اس حد تک الجھ گئے کہ ۱۹۲۷ء میں برطانوی ماہر نفسیات سپیر مین نے لکھا: "حقیقت میں ذہانت ایک ایسا لفظ بن گیا ہے جس کے اتنے زیادہ معنی ہیں کہ آخر کار اس کے کوئی معنی نہیں ہیں۔" ساٹھ سال گزرنے کے باوجود اس انتشار میں کمی نہیں آئی۔

نفسیات کی نصابی کتابوں کے مطالعہ سے مزید سوالات ابھرتے ہیں۔ مثلاً یہ کہ ذہانت کو انفرادی تفریق کے عنوان کے تحت رکھا گیا ہے جبکہ دوسرے موضوعات کو نہیں رکھا گیا۔ کیا افراد صرف ذہانت کے لحاظ سے مختلف نہیں ہیں؟ کیا افراد محرکات یا ادراک کی بنا پر ایک دوسرے سے مختلف نہیں ہوتے؟ پھر دوسرے موضوعات کے مقابلے میں ذہانت کے موضوع میں پیمائش پر بہت زیادہ زور دیا جاتا ہے۔ بلکہ ذہانت کے تصور کو کم اور اس کی آزمائش کو زیادہ اہمیت دی جاتی

ہے۔ نفسیات کے دوسرے موضوعات میں ایسا نہیں ہوتا۔ ذہانت کے موضوع میں وراثت اور ماحول کے اثرات پر بہت بحث کی جاتی ہے جبکہ نفسیات کے دوسرے موضوعات میں ایسی کوئی بحث نہیں ہوتی۔ اس مختصر سے مقالے میں ہم ذہانت کے بارے میں اٹھائے گئے ان اہم سوالات کا جواب دینے کی کوشش کریں گے۔

لفظ INTELLIGENCE لاطینی زبان کے لفظ INTELLIGERE سے نکلا ہے جو کہ INTER اور LEGERE سے بنا ہے جن کے معنی انتخاب کرنا، فرق پہچاننا، سمجھنا ہیں، یعنی ذہانت سوچ، تفکر اور ادراک سے علیحدہ چیز نہیں۔ قدیم زمانے میں فلسفیوں نے ذہانت کو انسانی فطرت، شعور یا ادراک جیسے تصورات سے علیحدہ نہیں کیا۔ یہاں تک کہ انیسویں صدی کے آخر تک ماہرین نفسیات نے ذہانت کو نفسیات کا کوئی علیحدہ موضوع ہی نہیں سمجھا۔ مثلاً ۱۸۹۰ء میں شائع ہونے والی امریکی فلسفی اور ماہر نفسیات ولیم جیمز کی مشہور کتاب THE PRINCIPLES OF PSYCHOLOGY میں INTELLIGENCE کا لفظ صرف دو مرتبہ استعمال کیا گیا اور ■ بھی فلسفیانہ انداز میں۔ ۱۹۰۱ء میں شائع ہونے والی امریکی ماہر نفسیات J.M.BALDWIN. کی جامع DICTIONARY OF PHILOSOPHY AND PSYCHOLOGY میں INTELLIGENCE کا علیحدہ ذکر ہی نہیں تھا بلکہ اس لفظ کو INTELLECT کے مترادف رکھا گیا تھا جس کے معنی عقل، ذہن یا فہم ہیں، اگر لفظ INTELLIGENCE کو بیسویں صدی کی ابتدا میں علم نفسیات میں کوئی اہمیت حاصل نہیں تھی تو پھر چند سالوں بعد یہ لفظ یورپ اور خاص طور پر امریکہ کے نفسیات دانوں میں اتنی اہمیت کیوں اختیار کر گیا؟ اس سوال کے جواب کے لئے ہمیں انیسویں اور بیسویں صدی کے ان تاریخی عوامل کا جائزہ لینا ہو گا جن کے زیر اثر ان ممالک میں ذہانت اور اس کی پیمائش کو فروغ حاصل ہوا۔

انیسویں صدی تک یورپی ممالک، خاص طور پر برطانیہ، نے ایشیا، افریقہ اور لاطینی امریکہ کے بیشتر ممالک پر قبضہ کر کے انہیں نو آبادیوں میں تبدیل کر دیا تھا۔ ان قوموں پر اپنی حکومت کو جائز ثابت کرنے کے لئے یورپیوں نے یہ نظریہ پھیلایا کہ سفید فام نسل ایشیا اور افریقہ میں پائی جانے والی نسلوں سے برتر ہے۔ لیکن انیسویں صدی میں تعلیم اور سائنسی نظریات کے عام ہونے سے پڑھے لکھے افراد میں اعلیٰ اور ادنیٰ نسل اور خون کے تصورات کا اثر کمزور پڑتا گیا۔ یورپی حکومتوں کو، خاص طور پر برطانیہ کو، ایک ایسے تصور کی ضرورت محسوس ہوئی جو بظاہر سائنسی معلوم ہو لیکن وہ سفید فام نسل کی برتری ظاہر کرے۔ یہ بھی ثابت کرنا ضروری تھا کہ یہ صلاحیت ورثے میں ملتی ہے۔ اور اسے بڑھایا نہیں جا سکتا، کیونکہ اگر ذہنی صلاحیت تعلیم و تربیت سے بڑھ سکتی ہو تو پھر ایشیائی باشندے بھی اسے حاصل کر سکیں گے۔ چونکہ یورپی حکومت کے نمائندے

نوآبادیوں میں مخصوص تربیت کے بغیر مختلف شعبوں کے سربراہ بنا دیئے جاتے تھے اس لئے یہ ثابت کرنا بھی ضروری تھا کہ ان میں ایک عمومی صلاحیت ہے جو ہر شعبے میں کارآمد ثابت ہوتی ہے اور کسی ایک شعبے یا پیشہ تک محدود نہیں۔ ان ضروریات کے تحت ذہانت کے معنی کو، جو کہ قدیم زمانے سے فہم و فراست کے معنی میں استعمال کیا جاتا تھا، ایک مخصوص صلاحیت میں بدل گیا جو محض ورثے میں ملتی ہے، جس پر ماحول کا کوئی اثر نہیں ہوتا، جو ساری عمر تبدیل نہیں ہوتی، اور جو ایک عمومی صلاحیت ہے اور ہر کام پر اثر انداز ہوتی ہے۔ ذہانت کے اس مخصوص تصور کو صرف نوآبادیوں میں استعمال نہیں کیا گیا بلکہ حکمرانوں نے اپنے ملک کے عوام کو قابو میں رکھنے اور امراء کی مراعات اور عوام کی خستہ حالت کو جائز قرار دینے کے لئے بھی ذہانت کے اس تصور کو استعمال کیا۔ تاریخی لحاظ سے اس سلسلے میں سب سے نمایاں اور اولین کردار برطانوی نفسیات دان فرانسس گالٹن کا تھا۔

گالٹن نے افریقہ اور دوسرے علاقوں کے دوروں کے بعد انیسویں صدی کی آخری دہائیوں میں یہ نظریہ پیش کیا کہ افریقی قوموں کے مقابلے میں سفید فام نسل اعلیٰ ذہنی صلاحیتوں کی مالک ہے جو کہ اسے ورثے میں ملتی ہیں۔ ایک اور تحقیق میں گالٹن نے دیکھا کہ برطانیہ میں اعلیٰ عہدوں پر فائز افراد کے باپ دادا عموماً اعلیٰ عہدوں پر کام کر چکے تھے، اور ان افراد کے بچوں کی اکثریت بھی بڑے عہدوں پر فائز تھی۔ اس تحقیق سے گالٹن نے یہ غلط نتیجہ نکالا کہ اعلیٰ نوکریاں کرنے والے اعلیٰ ذہنی صلاحیتوں کے مالک ہیں اور یہ صلاحیت ان کے بچوں میں ورثے میں منتقل ہوتی ہے۔ حقیقت میں برطانیہ میں اعلیٰ نوکریاں عموماً اثر و رسوخ کی بنا پر ملتی تھیں اور غریب بچے مثبت تعلیمی ماحول اور مواقع اور اثر و رسوخ کی کمی کی وجہ سے اعلیٰ عہدوں سے عموماً محروم رہتے تھے۔

اپنے نظریات کو درست ثابت کرنے کے لئے گالٹن نے پیمائش کا طریقہ اپنایا۔ اس کا خیال تھا کہ افراد کی ذہنی صلاحیتوں میں فرق کے بارے میں سائنسی نتائج صرف پیمائش سے حاصل کیے جا سکتے تھے۔ گالٹن کے الفاظ میں: "جب تک علم کی کسی شاخ کے مظاہر کو اعداد میں منتقل کر کے ان کی پیمائش نہ کی جائے یہ مظاہر سائنس کا رتبہ اور وقار حاصل نہیں کر سکتے۔" گالٹن کو پیمائش کرنے کا اس حد تک جنون تھا کہ کچھ ماہرین نفسیات کے خیال میں یہ جنون NEUROTIC COMPULSION کی حد تک بڑھ گیا تھا۔ یہاں تک یہ بات قابل ذکر ہے کہ اٹھارویں صدی میں ڈاکٹروں نے طب کے پیشے کے وقار کو بڑھانے اور اسے ایک معروضی سائنسی رتبہ عطا کرنے کے لئے کلینکی ٹیسٹوں کا استعمال شروع کیا تھا۔ اس قسم کے ٹیسٹوں کی ضرورت خاص طور پر ان نااہل ڈاکٹروں کو پیش آئی جنہیں مرض کی شناخت کے لئے ٹیسٹوں پر انحصار کرنا

پڑتا تھا۔ گالٹن ان ماہرین نفسیات میں سے تھا جنہوں نے پیمائش اور آزمائشوں کا سہارا لے کر ذہنی صلاحیت کے بارے میں اپنے متعصب نظریات کو سائنسی رتبہ عطا کرنے کی کوشش کی۔

انیسویں صدی میں برطانیہ میں دولت اور مراعات کی غیر مساوی تقسیم کی وجہ سے امرأ اور عوام کے حالات میں نمایاں فرق تھا۔ گالٹن نے اس معاشرتی ناہمواری کے اصل اسباب کو چھپانے کے لئے یہ نظریہ پیش کیا کہ امرأ اور عوام کی ذہنی صلاحیتوں میں فرق ہے اور اس وجہ سے ان کے معاشرتی حالات میں بھی فرق ہے۔ یعنی جو شخص امیر ہے وہ اپنی ذہنی صلاحیتوں کی وجہ سے امیر ہے اور جو غریب ہے وہ اپنی کم عقلی کی وجہ سے غریب ہے۔ لیکن گالٹن کے پاس کوئی ثبوت نہیں تھا کہ امرأ واقعی ذہین ہیں اور عوام میں ذہانت کا فقدان ہے۔ اس مقصد کے لئے گالٹن نے نارمل تقسیم NORMAL DISTRIBUTION کے تصور کو استعمال کیا۔ کچھ سال پہلے ایک ریاضی دان نے ثابت کیا تھا کہ انسان کے قد اور دوسری جسمانی خصوصیات میں نارمل تقسیم ہے یعنی چند فیصد افراد بہت لمبے یا بہت چھوٹے قد کے ہیں جبکہ اکثریت کا قد اوسط درجے کا ہے۔ گالٹن نے بغیر کسی تحقیق یا ثبوت کے یہ مفروضہ قائم کیا کہ افراد کی ذہنی صلاحیتوں میں بھی نارمل تقسیم ہے۔ یعنی چند فیصد افراد بہت ذہین ہیں، چند فیصد کند ذہن ہیں، جبکہ اکثریت کی ذہنی صلاحیت اوسط درجے کی ہے۔ یعنی گالٹن کے مطابق جسمانی صلاحیتوں کی طرح معاشرے میں ذہنی صلاحیتوں کی ایک قدرتی اور فطری تقسیم ہے جو کبھی تبدیل نہیں ہوتی۔ اور چونکہ ذہنی صلاحیتوں میں فرق کی وجہ سے معاشرتی ناہمواریاں تھیں اس لئے یہ ناہمواری بھی قدرتی اور اٹل تھی۔ گالٹن نے نارمل تقسیم کے مفروضے کی بنیاد پر مختلف شماریاتی طریقے ایجاد کیے اور انہیں ذہنی صلاحیتوں کی پیمائش کے لئے استعمال کیا، مثلاً معیاری انحراف STANDARD DEVIATION لیکن ذہنی صلاحیتوں کی نارمل تقسیم کا مفروضہ کبھی ثابت نہیں ہوا۔ اس کے علاوہ بہت سے شماریاتی اصول جو فطری سائنسوں میں استعمال ہوتے ہیں وہ نفسیاتی پیمائش میں استعمال نہیں ہوسکتے۔ اس کے باوجود ذہانت کی ساری مشہور اور مقبول آزمائشیں جو آج تک تیار کی گئیں ہیں سب کی نارمل تقسیم اور اس سے حاصل کردہ شماریاتی طریقوں کی بنیاد پر تیار کی گئی ہیں۔ ظاہر ہے کہ ان آزمائشوں کی کوئی سائنسی حیثیت نہیں ہے۔

گالٹن نے یہ نظریہ پیش کیا کہ تعلیم و تربیت سے ذہنی صلاحیتوں کو بہتر نہیں بنایا جا سکتا۔ اس کے مطابق اعلیٰ ذہنی صلاحیتوں کو فروغ دینے کے لئے اعلیٰ نسل کے افراد کی افزائش نسل کرنی چاہیئے اور ادنیٰ نسل کے افراد کی افزائش روکنی چاہیئے۔ ۱۸۶۵ء میں گالٹن نے ایک مضمون لکھا، جس میں اس نے کہا:

"گھوڑوں اور مویشیوں کی افزائش نسل پر جتنی رقم خرچ کی جاتی ہے اور جتنی محنت کی

جاتی ہے اگر اس کا بیسواں حصہ انسانی نسل کی افزائش پر خرچ کیا جائے تو ہم فطین افراد کی بڑی تعداد پیدا کر سکتے ہیں۔"

نسل کے بہتر بنانے کے اس طریقے کو گالٹن نے یوجنکس (EUGENICS) کا نام دیا اور اس مقصد کے لئے اس نے یوجنکس سوسائٹی تشکیل دی۔ یوجنکس درحقیقت فاشسٹ نظریے کا حصہ ہے جو کہ غیر جمہوری حاکمانہ نظام، نسل پرستی، عوام دشمنی، ابہام پرستی، جنگجوانہ وطن پرستی CHAUVINISM، اور رجعت پسند سوچ پر مشتمل ہے۔ یوجنکس کی تحریک نے اٹلی اور جرمنی میں فاشسٹ نظریات پھیلانے میں اہم کردار ادا کیا تھا۔ جس میں ہٹلر کی نازی پارٹی ایک خالص فاشسٹ پارٹی بھی شامل تھی جس نے دنیا کو دوسری جنگ عظیم میں دھکیل دیا۔ یہ بات قابل ذکر ہے کہ برطانیہ اور امریکہ میں جن ماہرین نفسیات نے ذہانت کی آزمائشیں بنانے اور پھیلانے میں نمایاں اور بنیادی کردار ادا کیا وہ سب مختلف یوجنک سوسائٹیوں کے ممبر تھے یا ان سے قریبی روابط رکھتے تھے۔ ان میں سپیرمین، تھارانڈائک، میکڈوگل، گوڈارڈ، ٹرمین، اور یرکیز خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

یورپ میں جمہوری انقلاب کے بعد ۱۸۸۱ میں فرانس میں تعلیم عام ہوئی اور پبلک اسکول قائم کیئے گئے۔ ان اسکولوں میں جو غریب بچے پڑھتے تھے وہ عموماً درمیانے طبقے کے بچوں سے پیچھے رہ جاتے تھے کیونکہ ان کا ماحول، جس میں ان پڑھ والدین بہت سے بچے، خوراک کی کمی، وغیرہ شامل تھیں، تعلیم کے لئے سازگار نہ تھا۔ ان اسکولوں کو چلانے کے لئے اعلیٰ اور درمیانے طبقے سے ٹیکس لیا جاتا تھا۔ ان طبقوں کے والدین نے حکومت پر دباؤ ڈالا کہ وہ کند ذہن بچوں کو اسکولوں سے نکالیں کیونکہ ان کی وجہ سے باقی بچوں کی تعلیمی کارکردگی پر برا اثر پڑتا تھا۔ اس الزام کے پیچھے یہ خوف بھی تھا کہ کہیں درمیانے طبقے کے بچے غریب بچوں کی عادات نہ اپنا لیں۔ (جس طرح ہمارے پبلک اسکولوں میں کئی والدین اس بات پر افسوس کا اظہار کرتے ہیں کہ ان کے بچے ڈرائیوروں اور چپڑاسیوں کے بچوں کے ساتھ ایک جگہ پڑھتے ہیں)۔ قانونی لحاظ سے کند ذہن بچوں کو اسکولوں سے نکالا نہیں جاسکتا تھا۔ یہ مسئلہ ذہانت کی آزمائش نے حل کیا۔

ایلفرڈ بینے ایک سوسائٹی کا سرگرم رکن تھا جس نے فرانسیسی حکومت کی وزارت برائے تعلیم عامہ کو اس بات پر آمادہ کر دیا کہ پبلک اسکولوں کے بچوں کی نفسیاتی اور طبی آزمائش کی جائے تاکہ نارمل اور پسماندہ بچوں میں تمیز کی جاسکے۔ اس مقصد کے لئے بینے اور اس کے جونیئر ساتھی ڈاکٹر سائمن نے نارمل اور پسماندہ بچوں کے دماغوں کے سائز اور ان کی بناوٹ، ان کے ہاتھوں کی لکیریں، انکی لکھائی کا انداز اور کئی طریقے آزمائے لیکن وہ نارمل اور پسماندہ بچوں میں تمیز نہ کر سکے۔ آخر ۱۹۰۵ء میں بینے اور سائمن نے ایک سکیل تیار کیا جو ان کے خیال میں نارمل

اور ذہنی پسماندہ بچوں میں تمیز کرتا تھا۔ اس اسکیل میں ۳۰ آزمائشیں تھیں جو کہ آسان ترین سے لے کر مشکل ترین تھیں۔ آزمائشوں کی کچھ مثالیں درج ذیل ہیں:

۱۔ چاکلیٹ اور لکڑی کے مربع میں فرق کرنا
۲۔ تصویروں میں دکھائی گئی چیزوں کے نام لینا
۳۔ تین اسموں کو ایک فقرے میں استعمال کرنا
۴۔ ایسی اصطلاحات کی تعریف کرنا جو ٹھوس نہ ہوں۔ مثلاً عزت اور دوستی وغیرہ

ان آزمائشوں کی ذہنی سطح متعین کرنے کے لئے بینے نے اسکولوں کے پرنسپل اور اساتذہ کی مدد لی۔ ان افراد نے اپنی کلاسوں سے سب سے ذہین، سب سے کند ذہن، اور اوسط درجے کے بچوں کا انتخاب کیا۔ جس عمر کے اوسط درجے کے بچوں کی اکثریت ایک آزمائش کو حل کر لیتی وہ اس کے ذہنی سطح کی آزمائش قرار پاتی۔ اگر اسی عمر کا ایک ذہین بچہ اس آزمائش کو حل کر لیتا لیکن کند ذہن بچہ نہ کر سکتا تو اس آزمائش کو ایک صحیح آزمائش قرار دیا جاتا۔

بینے کی بنائی ہوئی ذہانت کی آزمائش کو ہماری نفسیات کی اکثر کتابوں میں ایک انقلابی اور اہم کارنامہ قرار دیا جاتا ہے۔ لیکن حقیقت میں اس کے سکیل میں بہت سی خامیاں تھیں۔ یہ اسکیل پہلے ۵۰ اور بعد میں ۳۰۰ بچوں پر آزمایا گیا تھا جو پیرس کے شہر میں رہتے تھے اور جو کسی طرح بھی فرانس کی تمام آبادی کی نمائندگی نہیں کرتے تھے۔ اس میں زیادہ ایسی آزمائشیں شامل تھیں جن سے درمیانے طبقے کے شہری بچے زیادہ واقف تھے۔ اسکیل میں اساتذہ کے اپنے تعصبات بھی شامل تھے کیونکہ وہ خود درمیانے طبقے سے تھے۔ تحقیق سے پتہ چلتا ہے کہ فرد اپنے طبقے کے افراد کو دوسروں کے مقابلے میں زیادہ نارمل سمجھتا ہے۔ اس کے علاوہ بچوں کو ذہین یا کند ذہن قرار دینے کی بنیاد ذہانت نہیں تھی بلکہ اسکول کی کارکردگی تھی۔ اس طرح بینے کا اسکیل ذہانت کا اسکیل نہیں تھا بلکہ اسکول کی کارکردگی کا ایک عکس تھا۔ یہ کوئی تعجب کی بات نہیں کہ بینے کے اسکیل پر فرانس ہی کے دیہاتی اور غریب بچوں کی ذہانت عموماً شہری اور درمیانے طبقے کے بچوں سے عموماً کم نکلتی تھی۔

مقیاس ذہانت یا IQ (INTELLIGENCE QUOTIENT)

بینے نے اپنے اسکیل میں ذہنی سطح کا تصور استعمال کیا تھا۔ ۱۹۱۲ میں جرمن ماہر نفسیات سٹرن نے اس اصطلاح کا ترجمہ ذہنی عمر کر دیا۔ کیونکہ وہ اسے IQ کے فارمولے میں استعمال کرنا چاہتا تھا۔ IQ کے فارمولے میں ذہنی عمر کو فرد کی اپنی عمر سے تقسیم کیا جاتا ہے اور پھر ۱۰۰ سے

ضرب دیا جاتا ہے۔ IQ کی اصطلاح کئی مغربی اور پسماندہ ممالک میں فراوانی سے استعمال ہوتی ہے لیکن اس کے استعمال کرنے والے اس کی حقیقت اور اس کی خامیوں سے ناواقف ہیں۔

۱۔ IQ کسی فرد کی ذہنی صلاحیت کی مقدار نہیں بتاتا بلکہ مختلف افراد کی ذہنی صلاحیتوں کا مقابلہ کرتا ہے۔ مثلاً اگر احمد کے ہم عمر بچوں کی اکثریت بہت ذہین ہے تو احمد کا ایک خاص IQ اسکور نکلے گا۔ لیکن اگر احمد کے ہم عمر بچوں کی اکثریت کم ذہین ہے تو احمد کا IQ پہلے سے بڑھ جائے گا۔ اسی طرح اگر احمد کی ذہنی سطح بڑھتی ہے اور اس کے ہم عمر بچوں کی ذہنی سطح بھی اتنی ہی بڑھتی ہے تو احمد کے IQ میں کوئی اضافہ نہیں ہوگا۔

۲۔ کئی ماہرین یہ تاثر دیتے ہیں کہ IQ اور ذہانت ایک ہی چیز ہیں۔ حقیقت میں ایسا نہیں ہے۔ ایک تو مختلف قسم کی ذہانت کی آزمائشوں پر ایک ہی فرد کے مختلف IQ نکل آتے ہیں۔ پھر ذہانت کی آزمائش کرنے میں بہت سے عوامل کارفرما ہوتے ہیں مثلاً فرد کی آزمائش سے واقفیت یا تجربہ، وقتی ذہنی کیفیت، محرکات (مثلاً بھوک، پیاس) وغیرہ، فرد کا IQ خالص ذہانت کی بنیاد پر نہیں نکلتا بلکہ اس طرح کے کئی عوامل اس میں شامل ہوتے ہیں۔

۳۔ IQ کے فارمولے میں ایک بڑی خامی یہ ہے کہ عمر کے بڑھنے کے ساتھ ساتھ ان ذہنی صلاحیتوں میں اتنی تیزی سے اضافہ نہیں ہوتا جن کی ذہانت کی آزمائشیں پیمائش کرتی ہیں۔ نتیجتاً عمر کے بڑھنے کے ساتھ ساتھ IQ میں کمی ہوتی جاتی ہے۔ اس خامی کو ماہرین مختلف شماریاتی طریقوں سے دور کرنے کی کوشش کرتے رہے لیکن وہ اس میں ناکام ہوئے اور آخر کار انہیں IQ کے فارمولے ہی کو رد کرنا پڑا۔ موجودہ دور میں جو ذہانت کی آزمائشیں بنائی جاتی ہیں ان میں IQ نارمل تقسیم کے اصولوں سے نکالا جاتا ہے۔ لیکن ہماری نفسیاتی کتابیں آج بھی IQ کے فارمولے کو اسی طرح اٹل سمجھتی ہیں جس طرح وہ IQ کے تصور کو سمجھتی ہیں۔

IQ کی درجہ بندی

اکثر افراد نے امریکی ماہر نفسیات ٹرمن کی IQ کی درجہ بندی پڑھی ہوگی جس میں افراد کو IQ کی بنیاد پر مختلف گروہوں میں تقسیم کیا ہے۔ مثلاً فطین، اعلیٰ ذہانت، اوسط ذہانت، ناقص ذہانت، وغیرہ اکثر نفسیات کی کتابوں میں اس درجہ بندی کو ایسے پیش کیا گیا ہے جیسے یہی ایک IQ کی درجہ بندی ہے جس پر دنیا کے سارے ماہرین نفسیات متفق ہوں۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ درجہ بندی ۱۹۱۶ میں بنائی گئی تھی اور اس کے علاوہ کم از کم ۲۳ قسم کی IQ کی درجہ بندیاں موجود ہیں جو کہ ایک دوسرے سے مختلف ہیں۔ ان درجہ بندیوں پر یہ اعتراض ہے کہ یہ بنانے والوں کی اپنی پسند اور ذاتی ترجیحات کی بنیاد پر بنائی گئی ہیں اور ان کا کوئی سائنسی جواز نہیں ہے۔ مثلاً

ٹرمن نے ۷۰ سے کم IQ کو ذہنی نقص قرار دیا جبکہ کسی اور نے اسے ٦۵ سے کم قرار دیا اور کسی اور نے ۷۲ سے کم۔ ایک ماہر نفسیات نے طنزیہ انداز میں ٹرمن کی درجہ بندی کا یہ جواز پیش کیا کہ اس میں ROUND FIGURES استعمال کئے گئے ہیں۔ (۷۰ سے ۸۰، ۸۰ سے ۹۰، وغیرہ) اور انہیں یاد کرنا آسان ہے۔ IQ کی درجہ بندی پر یہ بھی اعتراض ہے کہ اس میں تناسب کا بہت خیال رکھا جاتا ہے یعنی جتنے فیصد افراد بہت اعلیٰ ذہانت رکھتے ہیں بالکل اتنے ہی فیصد افراد ذہنی طور پر پسماندہ ہیں۔ لیکن کیا حقیقت میں بھی ایسا ہے؟ یا یہ تناسب صرف درجہ بندی کرنے والوں کے تخیل کی پیداوار ہیں؟

ذہانت کی آزمائشوں پر اعتراضات

پچھلے ۸۰ سالوں میں سو سے زیادہ ذہانت کی آزمائشیں تیار کی گئی ہیں۔ اتنی قسم کی آزمائشوں کا تیار کرنا بذات خود اس بات کا ثبوت ہے کہ ذہانت کی کوئی معیاری پیمائش نہیں ہے۔ ابتدا میں ذہانت کی آزمائش بنانے کا مقصد یہ بتایا گیا تھا کہ یہ فرد کی ذہانت کی پیمائش کا ایک معروضی طریقہ ہو گا۔ لیکن جب ایک تصور کی بہت سی تعریفیں ہوں۔ اس کو ناپنے کے مختلف طریقے ہوں، اور ذہانت کی درجہ بندی کے کئی طریقے ہوں، تو پھر یہ جواز ہی ختم ہو جاتا ہے کہ ذہانت کی آزمائش ایک معروضی پیمائش ہے۔ ان آزمائشوں پر سب سے بڑا اعتراض یہ ہے کہ یہ جس چیز کی پیمائش کے لئے بنائی گئی ہیں۔ اس چیز کی پیمائش ہی نہیں کرتے۔ اس کی بڑی وجہ تو یہ ہے کہ ذہانت کی تعریف پر ہی اتفاق نہیں۔ ان پر دوسرا اہم اعتراض یہ ہے کہ ان آزمائشوں میں افراد کے کردار کے جس نمونے کی پیمائش کی جاتی ہے وہ حقیقت میں ذہانت کی آزمائش نہیں کرتا۔ مثلاً ویکسلر کے ذہانت کے مشہور اسکیل میں اس طرح کے سوالات ہیں کہ "نیویارک اور پیرس میں کتنا فاصلہ ہے؟ امریکی صدر کا کیا نام ہے؟" وغیرہ۔ کیا یہ سوالات ذہانت کی پیمائش کرتے ہیں یا کتابی یا روزمرہ معلومات کو؟ ذہانت کی آزمائشوں پر ایک اور تیسرا بڑا اعتراض ان کی معیار بندی پر ہے۔ مثلاً سٹینفرڈ بینے ذہانت کے اسکیل کو دنیا کے مشہور اور سب سے معیاری آزمائشوں میں شمار کیا جاتا ہے۔ اس اسکیل کی معیار بندی امریکی ریاست کیلی فورنیا کے اسکولوں کے سفید فام بچوں پر کی گئی تھی۔ کیلی فورنیا کا شمار دنیا کے مہنگے ترین علاقوں میں ہوتا ہے اور اس میں زیادہ تر امیر طبقے کے بچے پڑھتے ہیں۔ پھر آزمائش کی تیاری میں سیاہ فام اور دوسرے ملکوں میں ہجرت کر کے آئے ہوئے امریکی افراد کے بچوں کو شامل نہیں کیا گیا تھا۔ اس لئے سٹینفرڈ بینے ذہانت کے اسکیل کو کسی طرح بھی امریکی بچوں کے لئے ایک معیاری آزمائش نہیں کہا جاسکتا۔ لیکن اسے نہ صرف امریکہ بلکہ پاکستان جیسے ممالک میں بھی کئی سالوں سے

استعمال کیا جا رہا ہے، اور ذہانت کی آزمائشیں تیار کرنے والے اپنی آزمائشوں کی صحت متعین کرنے کے لئے عموماً اسی اسکیل کو معیار کے طور پر استعمال کرتے ہیں۔ ذہانت کی آزمائشوں کی خامیوں کو دور کرنے کے لئے کچھ ماہرین نفسیات نے CULTURE-FAIR آزمائشیں بنانے کی کوششیں کیں۔ یعنی ذہانت کی ایسی آزمائشیں جو ساری دنیا کے افراد کے لئے یکساں ہوں۔ لیکن ماہرین نفسیات اس کوشش میں ناکام رہے ہیں۔ کیونکہ انسان کی سوچ، سمجھ بوجھ اور ذہانت کو اس کے ماحول اور تجربات یعنی اس کے کلچر سے علیحدہ نہیں کیا جا سکتا۔ پچھلے کچھ سالوں میں ذہانت کی آزمائشوں کے خلاف اعتراضات اس حد تک بڑھ چکے ہیں کہ دنیا کے بہت سے ممالک میں جن کے استعمال پر پابندی لگا دی گئی ہے اور جن ممالک میں اب تک پابندی نہیں لگی وہاں ان کے خلاف شدید احتجاج ہوئے ہیں۔ اس احتجاج کی اہم وجہ یہ ہے کہ یہ آزمائشیں مجموعی طور پر عوام کو تعلیم، نوکریوں، اعلیٰ عہدوں، اور ان کے جائز حقوق اور بنیادی سہولیات سے محروم رکھنے کے لئے استعمال کی گئی ہیں۔

ذہانت اور اس کی آزمائش کے اس جائزے سے یہ نتیجہ نکالنا درست نہ ہوگا کہ افراد کی ذہنی صلاحیتوں میں کوئی فرق نہیں ہے یا اس فرق کی پیمائش نہیں کی جا سکتی۔ ہمارے نزدیک زیادہ اہم سوال یہ ہے کہ ذہنی صلاحیتوں کی پیمائش کرنے کا مقصد کیا ہے۔ ہم نے دیکھا ہے کہ جن لوگوں نے ذہانت کی آزمائشوں کو فروغ دیا۔ وہ بنیادی طور پر ان کی مدد سے عوام کو مختلف سہولیات اور حقوق سے محروم رکھنا چاہتے تھے۔ لیکن یہ ضروری نہیں ہے کہ ذہانت کی آزمائشوں کو اسی مقصد کے لئے استعمال کیا جائے۔ ہمارے نزدیک آزمائش کا مقصد یہ ہونا چاہئیے کہ ان کی مدد سے فرد کی قابلیت اور کمزوریوں کی شناخت کی جائے اور پھر ایسے طریقے اختیار کئے جائیں جن سے کمزوریوں کو دور یا کم کیا جائے اور قابلیت کو بڑھایا جائے۔ کئی ماہرین نفسیات تعلیم، ذہنی امراض کے علاج، اور دوسرے شعبوں میں ذہانت اور دوسری صلاحیتوں کی آزمائشوں کو اسی قسم کے مقاصد کے لئے استعمال کر رہے ہیں۔ اس سلسلے میں ہمیں اس بات کا خیال کرنا ہوگا کہ ذہانت کی آزمائشیں کوئی دائمی اور معیاری آزمائشیں نہیں ہیں جو کہ ہر دور میں اور ہر قسم کے افراد پر لاگو ہو سکیں۔ اس لئے صرف چند منٹوں یا گھنٹوں کی ایک یا دو آزمائشوں کی بنیاد پر کسی فرد کے مستقبل کا فیصلہ کرنا جائز نہیں ہے۔ ہمیں فرد کی صلاحیتوں کی جانچ کے لئے ایسے طریقے استعمال کرنے چاہئیں جو فرد کے ماحول اور تجربات کو مد نظر رکھتے ہوں اور اسے اپنی ذہنی صلاحیتوں کے اظہار کا پورا موقع دیں۔

یہ معاملہ کہ ذہانت ورثے میں ملتی ہے یا ماحول سے ایک بے معنی بحث ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ پیدائش پر فرد میں بے پناہ مختلف خصوصیات حاصل کرنے کی صلاحیت موجود ہوتی ہے۔

اگر فرد کو سازگار ماحول ملتا ہے تو اس کی اچھی ذہنی نشو و نما ہوتی ہے اور اگر ماحول سازگار نہیں ملتا تو فرد کی صحیح نشو نما نہیں ہوتی، ماہرین حیاتیات کی تحقیقات سے یہ بھی ثابت ہو چکا ہے کہ بچے کی کمزوریوں اور خامیوں میں ماحول کا بہت زیادہ دخل ہے۔ ماحول کا اثر اسی وقت شروع ہو جاتا ہے جب بچہ ماں کے پیٹ میں ہوتا ہے۔ اگر ہم افراد کی ذہنی صلاحیتوں کو فروغ دینا چاہتے ہیں تو ہمیں بچے کی ماں کی جسمانی اور ذہنی صحت، بچے کی جسمانی صحت، اس کے گھر کے ماحول، اور بچے کی تعلیم پر توجہ دینا ہوگی۔ یعنی ہمیں اپنے صحت اور تعلیم کے نظام اور بچے کی پرورش کے طریقوں کو بہتر بنانا ہوگا۔ یہی وہ طریقے ہیں جن کی بدولت ہم اپنی آنے والی نسلوں کے بچوں کی ذہنی صلاحیتوں کو پروان چڑھا سکتے ہیں۔

(رفیق جعفر لاہور میں گورنمنٹ کالج آف ایجوکیشن برائے سائنس میں نفسیات کے اسسٹنٹ پروفیسر ہیں اور ان کی کتاب "نفسیات کا ارتقاً" پاکستان میں اس موضوع پر چھپنے والی بہترین کتاب ہے)۔

موجودہ حالات اور ترقی پسند مصنفین

ناظر محمود

"آج ہمارا ملک ایک لق ودق صحرا ہے جس میں شادابی اور زندگی کا نام و نشان نہیں ہے۔ ملک کا ذرہ ذرہ دکھ کی تصویر بنا ہوا ہے۔ ہمیں اس غم واندوہ کو مٹانا ہے اور از سر نو زندگی کے چمن میں آبیاری کرنا ہے۔ ادیب کا فرض یہ ہونا چاہیے کہ ملک میں نئی زندگی کی روح پھونکے، بیداری اور جوش کے گیت گائے ہر انسان کو امید اور مسرت کا پیغام سنائے اور کسی کو ناامید اور ناکارہ نہ ہونے دے۔"

یہ الفاظ ہمیں آج کی آواز معلوم ہوتے ہیں جو آج سے تقریباً نصف صدی پیشتر رابندر ناتھ ٹیگور نے کہے تھے۔ پچاس سال کا طویل عرصہ گذرنے کے بعد بھی ان الفاظ کا بر وقت ہونا اس بات کی دلیل ہے کہ ہمارا معاشرہ بنیادی طور پر آج بھی استحصالی ڈھانچہ پر کھڑا ہے۔ اس ڈھانچے کی بیرونی شکل وصورت میں یقیناً بڑی تبدیلیاں وقوع پزیر ہوئی ہیں اور یہی تبدیلیاں آج ہماری ذمہ داریوں کو اس دور کے ترقی پسند مصنفین کی ذمہ داریوں سے ممیز کرتی ہیں۔

جولائی ۱۹۳۵ء میں پیرس میں ساری دنیا کے ترقی پسند ادیبوں کی کانگریس میں مصنفوں کے نام جو اپیل شائع کی گئی اس کے الفاظ یہ ہیں۔

"رفیقان قلم! موت کے خلاف زندگی کی ہمنوائی کیجئیے۔ ہمارا قلم، ہمارا فن، ہمارا علم ان طاقتوں کے خلاف رکنے نہ پائے جو موت کو دعوت دیتی ہیں، جو انسانیت کا گلا گھونٹتی ہیں، جو روپے کے بل پر حکومت کرتی ہیں، جو کارخانہ داروں اور زبردستوں کی آمریت قائم کرتی ہیں اور

بالآخر فاشزم کے مختلف روپ دھار کر سامنے آتی ہیں اور یہی وہ طاقتیں ہیں جو معصوم انسانوں کا خون چوستی ہیں۔"

برصغیر میں انجمن ترقی پسند مصنفین کے قیام کے وقت ہندوستانی عوام کا سب سے بڑا مسئلہ تھا برطانوی استعمار سے نجات حاصل کرنا۔ اس جدوجہد میں ترقی پسند مصنفین نے اپنا بھرپور کردار ادا کیا اور پھر آزادی کے وقت مذہب کے نام پر ہونے والی ہولناک خونریزی کے خلاف عظیم الشان تخلیقات پیش کیں۔ اگر اس دور کی تحریروں کا جائزہ لیا جائے تو ہمیں ترقی پسند مصنفین کے قلم چار سمتوں میں رواں نظر آتے ہیں۔

(۱) برطانوی استعمار کے خلاف عوام کو ابھارنا۔

(۲) ہندو مسلم اور دوسرے مذاہب کے ماننے والوں میں ایکتا کا درس دینا۔

(۳) جاگیرداری اور سرمایہ داری کے خلاف جدوجہد کی ترغیب۔

(۴) برصغیر کے عوام کو اشتراکی نظام اور اس کی کامیابیوں سے روشناس کرانا۔

اگر ہم آج کے پاکستانی معاشرے میں ترقی پسند مصنفین کے لیے سمتوں کا تعین کرنا چاہتے ہیں تو ہمیں سب سے پہلے یہ فیصلہ کرنا چاہیے کہ آج ہم لفظ ترقی پسند سے کیا مطلب لیتے ہیں۔

۱۹۳۵ء میں ہندوستانی ترقی پسند ادیبوں نے جو پہلا مینی فیسٹو تیار کیا تھا اس میں ترقی پسندی اور قدامت پسندی کے بارے میں لکھا گیا کہ

"وہ سب کچھ جو ہمیں انتشار، نفاق اور اندھی تقلید کی طرف لے جاتا ہے قدامت پسندی ہے اور وہ سب کچھ جو ہم میں تنقیدی صلاحیت پیدا کرتا ہے جو ہمیں اپنی عزیز روایات کو بھی عقل و ادراک کی کسوٹی پر پرکھنے کے لیے اکساتا ہے، جو ہمیں صحت مند بناتا ہے اور ہم میں اتحاد اور یک جہتی کی قوت پیدا کرتا ہے، اسی کو ہم ترقی پسند کہتے ہیں۔"

لیکن یہ تشریح بہت سے ترقی پسند مصنفین کے لیے مکمل نہیں تھی۔ صرف ایک ہی سال کے بعد یعنی ۱۹۳۶ء میں انجمن ترقی پسند مصنفین کی پہلی کانگریس میں مولانا حسرت موہانی نے کہا۔

"محض ترقی پسندی کافی نہیں ہے۔ جدید ادب کو سوشلزم اور کمیونزم کی بھی تلقین کرنی چاہیے۔ اسے انقلابی ہونا چاہیے۔"

اس کے بعد کے دس سالوں میں یہ رویہ اتنا بڑھا کہ ۱۹۴۸ء میں احمد آباد کے ترقی پسند مصنفین کی کانفرنس کے صدارتی خطبہ میں کرشن چندر نے کہا۔

"............ میں اس بات پر سختی سے کاربند ہوں کہ آج کوئی ترقی پسند ادب صحیح

معنوں میں ترقی پسند نہیں ہوسکتا جب تک کہ وہ نہایت واضح صورت میں نہ صرف ہندوستان کے عوام بلکہ دنیا بھر کے عوام کے لیے ایک عقلی، منطقی، سائنسی اور تاریخی اعتبار سے کمیونسٹ انقلاب کی ضرورت محسوس نہ کرے۔ کمیونزم انسانیت کا اگلا قدم ہے۔ آج کے حالات میں صرف کمیونسٹ نظام ہی ایک بہتر اخلاقی اور خوبصورت سماج کو وجود میں لاسکتا ہے۔ جس میں عوام کی بنیادی ضروریات کا تحفظ کیا جاسکتا ہے۔ جس میں ہر آدمی کو روٹی، کپڑا، گھر اور کام مل سکتا ہے۔ جس میں تعلیم عام اور مفت مل سکتی ہے۔ جس میں مختلف تہذیبی اور تمدنی وحدتیں ایک ساتھ رہ کر ترقی کر سکتی ہیں اور اپنے آپ کو ایک دوسرے کا دشمن نہیں ہمدرد و معاون تصور کرتی ہیں۔ آج دنیا کے چھٹے حصے میں یہی ہو رہا ہے۔ جو ادب اس تجربے کی اہمیت کو نظر انداز کرتا ہے اور اس حقیقت سے چشم پوشی کرتا ہے اسے اپنے آپ کو ترقی پسند کہلانے کا کوئی حق نہیں۔"

یہ الفاظ تھے کرشن چندر کے جنہوں نے مندرجہ بالا اقتباس میں ترقی پسند ہونے کے لیے کمیونزم پر اعتماد کو ناگزیر قرار دیا۔ بعد کے برسوں میں انجمن نے خاص لچک پیدا کی اور یہ واضح کیا کہ انجمن کا کسی سیاسی جماعت سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ لیکن اس کے باوجود آج تک کچھ لوگ ترقی پسندیت کا وہی معیار تصور کرتے ہیں۔ بات صرف الفاظ کی نہیں بلکہ رویے کی ہوتی ہے۔ آج اگر ہمیں اپنی صفوں میں وہ وسعت نظر نہیں آتی تو اس کی ایک اہم وجہ ہمارا یہ انتہا پسندانہ رویہ بھی ہے۔ ہمیں یہ سمجھ لینا چاہیے کہ اب ہم اپنے قبیلے کو وسعت دیے بغیر آگے نہیں بڑھ سکتے۔

قومی تناظر میں ہمارا آج کا سب سے بڑا مسئلہ جمہوریت کا دفاع ہے اس لیے ہر وہ قوت جو جمہوریت پر یقین رکھتی ہے اور اس کے تحفظ کو اپنی ذمہ داری سمجھتی ہے ترقی پسند ہے۔ اب ہمارا رویہ یہ نہیں ہونا چاہیے کہ جو ہمارے ساتھ نہیں وہ ہمارا دشمن ہے بلکہ یہ کہ جو ہمارے دشمنوں کے ساتھ نہیں وہ ہمارا ہے۔ آج جو رجعت پسند نہیں ہے ہمیں اسے بھی اپنانا ہوگا۔ یہ بات اپنی جگہ مسلم ہے کہ صرف رجعت پسند نہ ہونا ترقی پسندی کی ضمانت نہیں ہے۔ لیکن رجعت پسند نہ ہونا بجائے خود ترقی پسندی کی پہلی سیڑھی ہے۔ اور ہمیں یہ سیڑھی بہت نیچی رکھنی چاہیے۔

جب ہم جمہوریت کی بات کرتے ہیں تو اس کا مطلب یہ نہیں ہوتا کہ پاکستان میں مکمل طور پر جمہوری نظام قائم ہوچکا ہے جس کے تحفظ کے لیے ہمیں لکھنا ہے۔ جمہوریت کا مطلب صرف سیاسی نظام کسی سیاستدان کے لیے تو ہوسکتا ہے لیکن ہمارے لیے جمہوریت کا مطلب ایک سیاسی نظام کے ساتھ معاشرے کا مجموعی جمہوری رویہ بھی ہے۔ اگر ہمیں موجودہ نازک جمہوریت کے تحفظ کے لیے لکھنا ہے تو سب سے پہلے خود موجودہ حالات کو سمجھنا ہوگا۔ صرف "جمہوریت بچاؤ" لکھ دینے سے ہم کوئی مقصد حاصل نہیں کرسکتے۔ ہمیں بہت وسیع پس منظر میں پاکستان میں موجودہ

جمہوریت کے قیام کے محرکات کو دیکھنا اور دکھانا چاہیے۔ ان وجوہات کو سمجھنا اور سمجھانا چاہیے جن کی بنا پر ہم یہ جانتے ہوئے بھی کہ اس جمہوریت کی بحالی میں کن طاقتوں نے بنیادی کردار ادا کیا ہے اور یہ کہ جمہوریت کن کے مفادات کا تحفظ کر رہی ہے ہم اس بات پر مجبور ہیں کہ اس کی حمایت کریں بلکہ اس کے تحفظ کو اپنا فرض سمجھیں۔

یہ ایک حقیقت ہے کہ جمہوری جدوجہد میں ترقی پسند مصنفین نے لاٹھیاں بھی کھائی ہیں اور قید و بند اور جلاوطنی کی صعوبتیں بھی برداشت کی ہیں۔ اب ہمارا کام صرف جمہوری حکومت کا ساتھ دینا نہیں بلکہ اس موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے پورے معاشرے کو جمہوری رویے کی طرف راغب کرنا ہے۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ یہ کام کیسے کیا جائے؟ ظاہر ہے جمہوری رویہ کوئی محض تجریدی خیال تو ہے نہیں۔ اسے ہمیں اپنی تحریروں میں ایک ٹھوس سماجی حقیقت کے طور پر روشناس کرانا ہے۔ اس حقیقت کو تسلیم کرانا ہے کہ ایک جمہوری اور سیکولر رویہ ہی ہمارے معاشرے کو مکمل تباہی و بربادی سے بچا سکتا ہے۔ اس کے تین پہلو ہیں۔

(۱) بنیاد پرستی اور استحصالی قوتوں کے خلاف جدوجہد۔

(۲) علاقائی اور نسلی منافرت کے خلاف جدوجہد۔

(۳) بدلتی ہوئی بین الاقوامی صورت حال کا ادراک اور تجزیے۔

جہاں تک بنیاد پرستی کا تعلق ہے تو ہمیں دو قسم کے بنیاد پرستوں کا مقابلہ کرنا ہے۔ پہلی بنیاد پرستی جو سب سے زیادہ خطرناک ہے وہ دائیں بازو کی بنیاد پرستی۔ دوسری ذرا کم خطرناک بنیاد پرستی ہے یعنی بائیں بازو کی بنیاد پرستی۔

اگر دائیں بازو کی بنیاد پرستی معاشرے کو اتنا پیچھے لے جانا چاہتی ہے جہاں واپسی ممکن نہیں ہوتی تو بائیں بازو کی بنیاد پرستی نہ صرف وقت سے پہلے اتنا آگے لے جانا چاہتی ہے جہاں جانے کے لیے معاشرہ تیار نہیں ہوتا بلکہ اس کے ساتھ ساتھ فرسودہ سوچ کو بھی گلے لگائے رکھنا چاہتی ہے۔

دائیں بازو کی بنیاد پرستی ہمیں مذہبی تنگ نظری اور فرقہ واریت کی آگ میں جھونکنا چاہتی ہے۔ یہ مذہبی بنیاد پرست دیدہ دانستہ معاشرے کے ارتقائی عمل کو روکنے کی کوشش کرتے ہیں یہ مذہب کو استحصالی طبقوں کے مفاد میں استعمال کرنا چاہتی ہے اور مسائل کا ذمہ دار قسمت کو قرار دیکر مذہبی وظیفوں میں اس کا حل تلاش کرتی ہے۔ یہ دائیں بازو کی مذہبی بنیاد پرستی ہماری سب سے بڑی دشمن ہے جس کا مقابلہ ہمیں اپنی تحریروں کے ذریعے کرنا ہے۔ اس مقصد

کے لیے ہمیں تحریروں کا دائرہ بہت وسیع کرنا ہوگا۔ اب ہم ایک افسانہ اور نظم پڑھ کر اس کے داخلی، خارجی، آفاقی اور جمالیاتی پہلوؤں پر ارسطو کے حوالے دے کر اور تجریدیت کے سمندر میں غوطے لگا کر بسوائے اپنے آپ کو دھوکہ دینے کے کچھ نہیں ادا کر سکتے۔ ہمیں افسانوں اور نظموں کے روایتی چکر سے نکل کر ٹھوس سائنسی بنیادوں پر کام کرنے کی ضرورت ہے۔ میرا یہ مطلب نہیں ہے کہ ہم سب کو سائنس دان بن جانا چاہیے بلکہ ہمیں کم از کم سماجی علوم کی سطح پر ایک صحیح سائنسی سوچ کی ضرورت ہے جس میں ادب بھی جدید سائنسی بدلتی ہوئی سوچ کا عکاس ہو۔

ہر قسم کی بنیاد پرستی کا مقابلہ صرف سائنسی بنیادوں پر ہی کیا جاسکتا ہے۔ اگر دائیں بازو کی بنیاد پرستی کا مقابلہ کرنے کے لیے ہمیں Science in History, Cosmos, Ascent of Man جیسی کتابوں کی اردو میں ضرورت ہے تو ——————————

بائیں بازو کی بنیاد پرستی کا مقابلہ کرنے کے لیے ہمیں پاکستانی معاشرے کے سماجی معاشی ڈھانچے کو کھنگالنے کی ضرورت ہے۔ پاکستان کی تاریخ کو ٹھوس سائنسی اور زیادہ معروضی نظر سے لکھنے اور سمجھنے کے بعد ہی ہم اپنے معاشرے میں بھرپور تخلیقی کردار ادا کر سکیں گے۔ یہ بات ہمیں علاقائی اور نسلی منافرت کے خلاف لکھتے ہوئے یاد رکھنی چاہیے۔

ہمارا معاشرہ آج نفرتوں کی جس دلدل میں دھنس رہا ہے۔ کیا ہم صرف اظہار افسوس کر کے اپنے آپ کو اس سے بچا سکیں گے؟ میں پھر وہی بات دہراؤں گا کہ سب سے پہلے تو ہمیں خود حالات کو سمجھنا چاہیے۔ ان محرکات کا جائزہ لینا چاہیے جنہوں نے آج ہمارے معاشرے کو اس نہج پر لا کھڑا کیا ہے ورنہ ہم بھی بہت سے "ترقی پسندوں" کی طرح اس دلدل میں پھنس جائیں گے اور نام نہاد حقوق کی فراوانی میں اپنے اصل دشمنوں کو بھول جائیں گے۔

علاقائی اور نسلی منافرت کا مقابلہ بھی ہم صرف دھواں دھار نظموں اور زوردار افسانوں سے نہیں کر سکتے۔ ان کی اہمیت تو اپنی جگہ ہے لیکن اس سے کہیں زیادہ اہمیت کے حامل پاکستانی معاشرے میں مصروف عمل قوتوں کے محرکات ہیں جن کے بارے میں تحقیق کا خانہ خالی ہے۔ آج کے ترقی پسند مصنف کو تاریخ، معاشیات، فلسفے اور دوسرے سماجی علوم کی مدد سے پاکستانی معاشرے کے ان پوشیدہ گوشوں کی نقاب کشائی کرنی ہے جس کے بارے میں خود بہت سے ترقی پسند بڑی حد تک ناواقف ہیں۔ نسلی منافرت کی ایک بڑی وجہ یہ بھی ہے کہ ہماری آبادی کا ایک حصہ دوسرے کے بارے میں اور دوسرا تیسرے کے بارے میں نابلد ہے۔ آج ترقی پسند مصنفین کو اس سمت میں خصوصی توجہ دینے کی ضرورت ہے۔ اس سلسلے میں تراجم بہت اہم کردار ادا کر سکتے ہیں تمام علاقائی زبانوں کے تراجم اردو میں اور اردو کے تراجم علاقائی زبانوں میں ہونے ضروری ہیں تاکہ ایک زبان بولنے والے دوسری زبان کے ادب کو بھی پڑھ سکیں اور اس

طرح انکے مسائل سے بھی آگاہ ہوسکیں اور صرف اپنے آپ کو مظلوم نہ سمجھیں۔

ہمارا ہر صوبہ بلکہ ہر علاقہ اپنے مخصوص معروضی حالات کا حامل ہے جو دوسرے علاقوں سے قطعی مختلف ہیں۔ ایسے میں اور بھی ضروری ہوجاتا ہے کہ ترقی پسند مصنفین تحقیقی کام کریں اور ہر علاقے کی تاریخ، ادب، ثقافت، سماجی نفسیات اور مجموعی سماجی معاشی ڈھانچے کے بارے میں تحریریں تخلیق کریں تاکہ ایک دوسرے سے اجنبیت کچھ تو کم ہو۔

علاقائی اور نسلی منافرت کی سب سے بڑی وجہ معاشی مسائل ہوتے ہیں۔ یہی بات سمجھانا ترقی پسند مصنف کی ذمہ داری ہے کہ معاشی استحصال کا اصل مرکز کیا ہے۔ قبائلی اور جاگیرداری نظام اور دولت کی غیر منصفانہ تقسیم کے خلاف عوام کو ابھارنے والی تحریریں ہر وقت کی اہم ضرورت ہیں۔

اب آئیے ذرا بدلتی ہوئی بین الاقوامی صورت حال کی طرف.... عین ممکن ہے کہ کچھ لوگ اسے سیاست دانوں کی ذمہ داری قرار دے کر عہدہ براں ہونے کی کوشش کریں لیکن آج ہمارے ملک میں ترقی پسند طاقتیں جتنی منتشر اور گومگوں کی کیفتیت کا شکار ہیں اس کی ایک بڑی وجہ بین الاقوامی طور پر رونما ہونے والی تبدیلوں کا ادراک نہ ہونا بھی ہے۔ ایسے میں ترقی پسند مصنفین کی ذمہ داری ہے کہ تغیر پزیر عالمی صورت حال کے بارے میں ٹامک ٹوئیاں مارنے والوں کو ایسی تحریریں فراہم کریں جن میں دنیا کی صحیح معروضی شکل نظر آئے۔

یہی وہ میدان ہے جہاں ہمارا مقابلہ بائیں بازو کی بنیاد پرستی سے ہوگا ہوسکتا ہے کہ کچھ لوگوں کو یہ اصطلاح بہت عجیب لگے لیکن دائیں بازو کی بنیاد پرستی اور بائیں بازو کی بنیاد پرستی میں کم از کم ۱۰ باتیں مشترک ہوتی ہیں۔

(۱) بنیاد پرستی کا زندگی کے ٹھوس حقائق سے کوئی تعلق نہیں ہوتا۔

(۲) بنیاد پرستوں کو معاشرے کی ارتقائی رفتار کا اندازہ نہیں ہوتا۔

(۳) بنیاد پرستی لوگوں کو ایک خیالی دنیا میں لے جانے کی کوشش کرتی ہے۔

(۴) بنیاد پرستی کا ڈھانچہ عقیدہ پرستی پر کھڑا ہوتا ہے۔

(۵) بنیاد پرستی اور شخصیت پرستی کا چولی دامن کا ساتھ ہوتا ہے۔

(۶) بنیاد پرستی مخصوص کتابوں کو مکمل ضابطہ حیات ثابت کرنے کی کوشش کرتی ہے۔

(۷) بنیاد پرستی مخصوص فارمولوں اور اقوال زریں کی مدد سے معاشرے کو بدلنے کی سعی کرتی ہے۔

(۸) بنیاد پرستی کسی ایسے انقلاب کی نوید سناتی ہے جنکا فی الوقت کوئی امکان نہیں۔

(۹) بنیاد پرستی نعرے بازی کی سیاست پر یقین رکھتی ہے۔

(۱۰) بنیاد پرستی اختلاف رائے کی دشمن ہوتی ہے۔

بین الاقوامی تناظر میں دیکھا جائے تو ترقی پسند مصنفین نے اکثر سوویت یونین اور دوسرے سوشلسٹ ممالک کے بارے میں عقیدت کے مارے ایسی تحریریں لکھی ہیں جن کا موازنہ سر تھامس مور کی یوٹوپیا اور ٹوماسو کیا نیلا کی (CITY OF THE SUN) سے کیا جاسکتا ہے۔ اس سلسلے میں ایک کتاب "ارضی جنت" خاص طور پر قابلِ ذکر ہے جس میں مصنف نے سوویت یونین کو "ارضی جنت" قرار دیا ہے۔ ایسی تحریروں نے ہمیں بین الاقوامی طور پر رونما ہونے والے ٹھوس حقائق کو سمجھنے سے محروم رکھا ہے اور ایک خیالی جنت میں لے جانے کی کوشش کی ہے۔

آج کے ترقی پسند مصنف کی ذمہ داری ہے کہ بائیں بازو کی عقیدہ پرستی اور شخصیت پرستی کے بارے میں بھی لکھے کیا یہ ترقی پسند مصنفین کی ذمہ داری نہیں تھی کہ جب بورس پاسترناک کے ناول "ڈاکٹر ژواگو" پر قطعی غیر ضروری اور غیر اخلاقی پابندی لگائی گئی تو وہ اس کے خلاف کچھ لکھتے۔ جب کے آج خود سوویت ذرائع ابلاغ سے پتہ لگ رہا ہے کہ "ڈاکٹر ژواگو" میں جو کچھ لکھا گیا وہ استالن کے ان مظالم سے بہت کم تھا جو اس نے حقیقت میں ڈھائے تھے۔ اگر ہم نے آج بھی ان موضوعات پر اپنے عوام کو صحیح صورت حال سے آگاہ نہیں کیا تو ہم آنے والی نسل کے سامنے اسی طرح جوابدہ ہوں گے جس طرح آج ہمارے سامنے ہمارے وہ بزرگ جوابدہ ہیں جنہوں نے سوویت یونین اور سوشلسٹ ممالک سے آنے والی تحریروں اور کتابوں کے علاوہ ان ممالک کے بارے میں ہر تحریر کو "بورژو پروپیگنڈہ" کہہ کر رد کر دیا تھا۔ جسے آج خود سوویت ذرائع ابلاغ صحیح قرار دے رہے ہیں۔

اگر کوئی یہ کہتا ہے کہ آج ہمارے ترقی پسند مصنف کا کام صرف اپنے ملک کے حالات کے بارے میں لکھنا ہے تو نہ صرف اپنی ذمہ داریوں سے پردہ پوشی کرتا ہے بلکہ ہمارے عوام کو اسی اندھیرے میں رکھنا چاہتا ہے جو اب ٹوٹ رہا ہے۔

آج کے بدلتے ہوئے بین الاقوامی حالات میں ہم اپنے آپ کو اور اپنے قارئین کو صرف ان کتابوں اور فارمولوں تک محدود نہیں رکھ سکتے جو آج سے ڈیڑھ سو سال پہلے لکھ دیئے گئے ہیں۔ آج ترقی پسند مصنفین کو صحیح جدلیاتی رویہ اپناتے ہوئے اپنی تحریروں کے ذریعے خود ساختہ انقلابی بتوں کو توڑنا ہے اور ان باتوں کو چھوڑ کر کہ "سامراج مر رہا ہے سامراج کمزور ہو چکا ہے اور آخری سانس لے رہا ہے۔" ہمیں اس موضوع پر لکھنا ہے کہ سامراج درحقیقت آج کہاں کھڑا ہے۔ جسے اب تک ہمارے بہت سے ترقی پسند مصنفین "بانجھ اور قریب المرگ" قرار دے رہے تھے کیا وہ واقعی اتنا بنجر اور غیر تخلیقی ہو چکا ہے؟ اگر ہاں تو پھر وہ کیا وجہ ہے کہ آج سوویت یونین اور دوسرے سوشلسٹ ممالک سامراجی کثیر القومی کمپنیوں سے جدید ترین ٹیکنالوجی حاصل کرنے کے

لیے بے چین ہیں اور اس سے سامراج مضبوط ہوگا یا کمزور؟

اگر ہم ان موضوعات پر نہیں لکھیں گے تو اپنے عوام کو کیسے سمجھائیں گے کہ آج فلپائن اور کوریا سے لے کر پاکستان تک جمہوریت بحال کر کے وہ کام کرنے والے جو ترقی پسندی کے زمرے میں آتے ہیں، یعنی فنون لطیفہ کو جمہوریت کی بقا کے لیے استعمال کرنا، ادب و ثقافت کو روشن خیالی کی ترغیب دینا معاشرے کو کھولنا، ادب و صحافت سے پابندیاں ختم کرنا۔ کچلے ہوئے طبقوں کو منظم کرنے کی بات کرنا۔ ٹریڈیونین اور طلبا تنظیمیں بحال کرنا۔ دقیانوسیت پر ضرب لگانا۔ جمہوریت پسند مصنفین کو منظم کرنا۔ کیا یہ سب کرنے والی طاقتیں ترقی پسند ہیں؟ اگر نہیں تو وہ کیا معروضی حالات ہیں جن میں وہ ایسا کر رہی ہیں؟ ترقی پسند مصنفین کو اس کا بھی ادراک ہونا چاہیے کہ کیا ہم یعنی ترقی پسند جامد تو نہیں ہوگئے؟ کیا استحصالی طاقتیں بہت تیز رفتاری کے سبب سماج کے ارتقائی عمل کو سمجھنے میں ہم سے آگے تو نہیں نکل گئیں۔

یہ وہ سوالات ہیں جن کے آگے آج بڑے بڑے سوالیہ نشانات کھڑے ہیں۔ ان کے جواب لکھنا آج ترقی پسند مصنفین کی ذمہ داری ہے۔

موجودہ حالات میں ہم مزید زبانی جمع خرچ کے متحمل نہیں ہوسکتے۔ وہ بھی ان حالات میں جبکہ ہمارا پریس اور بڑے اخبارات بنیاد پرست اور جمہوریت دشمن رویہ اپنائے ہوئے ہیں اور بڑی بے شرمی سے رجعت پرست قوتوں کا ساتھ دے رہے ہیں۔

یہ فیصلہ وقت کرے گا کہ ہم کس حد تک اپنی ذمہ داریوں کو پورا کرتے ہیں۔

(ناظر محمود ادبی و سیاسی موضوعات پر لکھنے والے نوجوان قلمکار ہیں)۔

پسماندہ ممالک میں سوشلزم

ڈاکٹر نوداری سیمونیا

پسماندہ ممالک میں سوشلزم کی جانب عبور کے بارے میں لینن کا نظریاتی اور عملی ورثہ آج بہت زیادہ اہمیت اختیار کر گیا ہے۔ اس کی اہمیت ایک طرف تو ان ترقی پذیر اقوام کی سماجی معاشی مشکلات کے حوالے سے ہے جو سوشلزم کی جانب عبور کے راستے پر گامزن ہیں تو دوسری جانب سوویت یونین میں تشکیل نو (پریسترائیکا) کے تحت اپنے تاریخی تجربے کے تنقیدی جائزے نے اسے مزید دوچند کر دیا ہے۔ ایک چیز جو چونکا دینے والی ہے ایسی متواتر کوششیں ہیں جس میں سوشلسٹ پذیری SOCIALISTORIENTATION کو خیرباد DEBUNK کہا جا رہا ہے۔ یہ کوششیں کسی طور پر بھی چھٹی اور ساتویں دھائی میں سوویت اسکالروں کی جانب سے اپنائے جانے والے اس موقف سے کم زور دار نہیں ہیں جب انہوں نے یہ موقف اختیار کیا تھا کہ قومی آزادی کے انقلاب نامکمل ہیں اور انہیں لازماً بورژوا جمہوری دائرہ سے نکل کر سوشلسٹ انقلاب میں تبدیل ہونا تھا۔

اس وقت یہ بات خاصی خوش امیدی کی باعث بن رہی تھی کہ ایشیا اور افریقہ کی کچھ حکومتوں نے سوشلسٹ پذیری کا اعلان کر دیا تھا اور آج ناامیدی اور بداعتمادی اس حقیقت سے ابھری ہے کہ اس راستے پر عملدرآمد کے دوران ان ممالک کو خاصی ابتری کا سامنا کرنا پڑا ہے۔ دونوں صورتوں میں ایک مخصوص تاریخی مظہر کی غلط اور غیر سائنسی آفاقی توجیہہ کی گئی۔

سائنس اور اسی طرح سیاست میں ادھورے پن، انتہا پسندانہ نقطہ نظر اور موضوعی رویوں کو معقولیت کے خلاف گردانا جاتا ہے۔ آج ہم اپنے تجربے کو سنجیدگی سے پرکھ رہے ہیں اور اپنی سوشلسٹ ترقی کی نوعیت اور درجے کا ازسر نو تعین کر رہے ہیں۔ اسی طرح ہمیں مشرقی اقوام کے سوشلزم میں عبور کے دور کی نوعیت کے بارے میں اپنے نقطہ نظر کو تبدیل کرنا پڑے گا۔

یہ اس لیے بھی فوری اہمیت کا حامل ہے کیونکہ پسماندہ ممالک کے سوشلزم میں عبور کے لیے ابتدائی شرط کا ذکر کرتے ہوئے ہم متفقہ طور پر ایک ہی نقطہ پر زیادہ توجہ دیتے ہیں وہ ہے عالمی سوشلسٹ نظام بالخصوص سوویت یونین کی موجودگی اور ہمارے تجربے سے استفادے کے امکانات۔ حقیقتاً بہت سے سوشلسٹ پذیر ممالک نے ہمارے ہی تجربے کو مستعار لیا خواہ وہ اس کا اقرار کریں یا نہ کریں۔ تاہم یہ سوال ضرور ابھرتا ہے کہ ان ممالک نے درحقیقت کیا مستعار لیا؟ کیا ان ممالک نے ہمیشہ کلیتاً مثبت عناصر مستعار لیے جو کہ لینن کے نظریاتی ورثے کے حقیقی جوہر اور اس کی ترقی کے نتائج پر مبنی تھے۔

ہم ان سوالات کے جتنے مکمل اور تسلی بخش جوابات دیں گے اتنا ہی یہ آسان ہو گا کہ پسماندہ اقوام کی سوشلزم میں عبور کی مشکلات کی گتھیوں کو سلجھا سکیں۔ جیسا کہ ہم دیکھتے ہیں کہ مشرقی اقوام نے سوشلزم کی جانب عبوری مرحلے کی بجائے سوشلزم کی تعمیر کا مخصوص تجربہ مستعار لیا جبکہ سوشلزم کی جانب عبور کے فرائض پورے نہیں کیے گئے اور سوشلزم کی تعمیر بھی ہمیشہ سوشلسٹ طریقوں سے نہیں کی گئی۔ دوسرے الفاظ میں جو سب سے بڑی نظریاتی و عملی غلطی سرزد ہوئی وہ یہ تھی کہ سوشلزم میں عبور کو سوشلزم سمجھا گیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ دو بنیادی طور پر مختلف قسم کے عبوری دور آپس میں غلط ملط ہو گئے۔ ایک جس کا ذکر مارکس نے "گوتھا پروگرام کی تنقید" میں کیا ہے جس میں سوشلزم کا مطلب "کمیونزم کا پہلا دور" لیا گیا ہے اور دوسرا لینن کا تصور جو ۱۹۲۱ء کے بعد کی روس میں صورتحال پر لاگو ہوتا ہے یعنی سوشلزم میں عبور کا ماقبل سوشلسٹ دور۔

مارکسی تصور کی بنیاد مغربی یورپ میں سرمایہ داری کے ابتدائی ماڈل کے تجزیے پر تھی جو کہیں پر بھی ظہور پذیر نہیں ہوا۔ لیننی تصور سرمایہ داری کے دوسرے روسی ماڈل سے متعلق تھا جس پر عمل درآمد یوں ہوا کہ یہ انقلاب سامراج کی کمزور ترین کڑی کے ٹوٹنے سے واقع ہوا نہ کہ کسی ترقی یافتہ سرمایہ دار ملک میں۔

کیونکہ دو مختلف طرح کے عبوری ادوار کو آپس میں غلط ملط کر دیا گیا تھا اس لیے ہمارے بہت سے ماہرین سیاسی معاشیات، فلسفیوں اور ماہرین عمرانیات نے اس بنیاد پر یہ دعویٰ کیا کہ مارکس اور اینگلس نے مستقبل کے سوشلسٹ معاشرے کے اہم خدوخال کے بارے میں غلط اندازہ

لگایا تھا (مثلاً ریاست، جنس تجارت اور زر کے تعلقات اور قدر کے قانون وغیرہ کا معدوم ہو جانا) لیکن مارکسزم لینزم کے بانیوں کے ذہنوں میں دراصل ترقی یافتہ سوشلسٹ سماج کا نظریاتی خاکہ تھا یعنی کمیونزم کے پہلے دور کا۔ یہ ہے پہلی بات۔ دوسری بات یہ ہے کہ وہ سمجھتے تھے کہ خود کمیونسٹ سماج کے پہلے دور میں بھی سرمایہ دارانہ نظام کے کچھ پیدائشی نشانات BIRTHMARKS ہوں گے جو کہ آہستہ آہستہ ختم ہوتے جائیں گے۔

یہی وجہ ہے کہ عبوری دور کی ضرورت پڑتی ہے کیونکہ پرانے سماجی ڈھانچے اور اس کے پیداواری تعلقات کسی فرمان کے ذریعے یا راتوں رات بنائے گئے کسی نئے ڈھانچے سے تبدیل نہیں کئے جاسکتے۔ اگر سابقہ سماجی تشکیل سوشلسٹ سیاسی انقلاب سے پہلے ہی لوٹ پھوٹ کا شکار ہوچکی ہوتی تو پرانے ڈھانچے کے اجزا اور تعلقات جو اس تشکیل سے مطابقت رکھتے تھے بھی انقلاب کے ساتھ ختم ہونے کے عمل میں رہتے۔ نہ تو مارکس اور اینگلس اور نہ ہی لینن نے اپنے ذمے مستقبل کے سوشلسٹ سماج کا تفصیلی خاکہ پیش کرنے کا بیڑا اٹھایا۔ اس لئے کچھ عالموں کی طرف سے روس میں عبوری دور کے بارے میں لینن کے حقیقی شاندار خیالات کو سوشلزم کی سیاسی معیشت کے طور پر پیش کرنے (بالخصوص اسٹالن کی متواتر تشریحات) کا حقیقی سائنس سے کوئی تعلق نہیں۔

سوویت روس بالخصوص اس کے غیر روسی علاقوں کے کئی اہم خدوخال انہیں ان مشرقی ممالک سے کسی حد تک مشابہہ رکھتے تھے جنھوں نے سوشلزم کا راستہ اپنایا۔ ان خدوخال میں جو بات خاص طور پر مشترکہ تھی وہ ان معاشروں کے سماجی و معاشی نظام میں مختلف سماجی تشکیلوں کے باہم مربوط اجزا کی موجودگی تھی (لینن اسے کثیر التشکیلی ڈھانچہ کہتا تھا)۔ اس مظہر کی بنیادی وجہ دوسرے درجے کی سرمایہ داری کی بتدریج غالب آنے کی خصوصیت تھی جو ایک ہی دور میں مختلف تشکیلوں کو برقرار رکھتے ہوئے ان پر غلبہ حاصل کرتی تھی (اس کے علاوہ مستقبل کے سوشلسٹ سماج کے مختلف پہلوؤں نے اپنے آپ کو انتہائی ناہموار طریقے سے ظاہر کیا)۔ یہی وجہ ہے کہ روس میں دو مختلف عبوری ادوار میں واضح خط امتیاز نہیں کھینچا گیا (یعنی سیاسی انقلاب جو نیچے سے ہوا)۔ ۱۹۱۷ء کے سیاسی انقلاب کے بعد سے یہ عمل متواتر مختلف اصلاحات کے ساتھ ساتھ عمومی طور پر ارتقائی نوعیت اور "اوپر سے انقلاب" کا رہا ہے۔ جس کی وجہ سے دو بنیادی طور پر مختلف عبوری ادوار کو آپس میں غلط ملط کرنا آسان ہوا۔ جوزف اسٹالن نے اپنے دور میں اس کا ماہرانہ استعمال کیا اور لینن کی نئی اقتصادی پالیسی NEP کو ختم کر کے مرکزیت پسند نوکر شاہانہ ریاستی سوشلزم کا ماڈل تھوپ دیا۔

روس میں عبوری دور کی ایک اہم خصوصیت سیاسی اقتدار اور پیچ میل بنیاد میں نامطابقت

تھی۔ اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہے کہ سرمایہ داری کے ابتدائی مرحلے سے متعلق ممالک میں پرامن یا غیر پرامن انقلاب کے فوراً بعد ہی نئے سیاسی اقتدار اور بنیاد میں مطابقت پیدا ہوجائے گی۔ نکولائی بخارین سے بحث کے دوران لینن نے دلائل سے ثابت کیا کہ سرمایہ داری کے دور میں سماجی ڈھانچوں کو مکمل اجارہ داری کے تحت لانا ناممکن ہے۔ اس طرح ان ممالک میں مختلف سماجی معاشی تشکیلات بڑے عرصے تک قائم رہیں گی اور کمیونزم کے پہلے مرحلے تک آہستہ آہستہ ختم ہوں گی۔ لیکن انقلاب کے فوراً بعد سیاسی اقتدار کو اس سے مطابقت رکھنے والا ریاستی اجارہ دارانہ ڈھانچہ موجود ہوگا۔ جبکہ سوویت روس میں یہ بنیاد اب تک بنائی جاتی تھی اور درحقیقت ہم اسے آج تک بنا رہے ہیں۔

اس سے عبوری دور میں بنیاد کی نوعیت اور اسے سوشلسٹ خطوط پر تبدیل کرنے کے بارے میں سوال اٹھتا ہے۔ اس سلسلے میں آج تک ڈھیر ساری غلطیوں میں سب سے بڑا حصہ اس مسئلے پر اسٹالن کا "نظریاتی اضافہ" ہے۔ اس کا نقطہ نظر درحقیقت مارکسزم کے بنیادی اصول یعنی پیداواری قوتوں کے معروضی کردار کی نفی پر مبنی تھا۔ اسٹالن نے موضوعیت پسندانہ رویہ اختیار کرتے ہوئے تعلقات پیداوار کے نظام پر ملکیت کے قانونی تعلقات تھونپ کر انہیں رہنماؤں کے ماتحت کر دیا۔ انقلاب سے پہلے روس میں پیداواری تعلقات کسی حد تک پیداواری قوتوں کی کم ترقی یافتہ حیثیت سے مطابقت رکھتے تھے حالانکہ وہ پوری طرح مجتمع اور مرتکز نہیں تھیں۔ یقیناً یہ تعلقات پیداوار رات بھر میں سوشلسٹ نہیں بن سکتے تھے اور صرف ظاہری طور پر ایسا تاثر قائم ہوا۔ لینن کا اس سلسلے میں نقطہ نظر یہ تھا (NEP) کہ کیونکہ حقیقی سوشلزم کے لئے پیداواری قوتیں اور پیداواری تعلقات پوری طرح سے موجود نہیں تھے اس لئے یہ ضروری تھا کہ موجود پیداواری قوتوں اور پیداواری تعلقات جو ان سے مطابقت رکھتے تھے ان سے یہ کام لیا جائے۔ اس سوچ کے مطابق سوویتوں کو مختلف ٹرسٹوں کے سربراہوں سے تجارت و حرفت سیکھنی تھی۔ ریاستی سرمایہ داری کی مختلف شکلوں کو استعمال کرتے ہوئے ماقبل سوشلسٹ ڈھانچوں میں موجود مرتکز سرمایہ کو نئی پیداواری قوتوں کی تخلیق کے لئے استعمال کرنا تھا تاکہ اس بنیاد پر نئے پیداواری تعلقات تشکیل دیئے جاسکیں۔

عبوری دور کو ہی سوشلزم سمجھ لینے کی وجہ سے پرولتاری ریاست کی طرف سے شروع کیے گئے ابتدائی ارتکاز کو (تیار شدہ مصنوعات اور زرعی پیداواری اشیاء کی قیمتوں میں فرق، ریاستی ٹیکس اور قرضے، اجارہ داروں سے محصولات وغیرہ) سوشلسٹ ارتکاز سمجھ لیا گیا تھا۔ اس میں ایک منطق یہ تھی کہ کیونکہ ماقبل پیداواری تعلقات کو اسٹالن نے ایک ہی جھٹکے سے سوشلسٹ پیداواری تعلقات میں تبدیل کر دیا ہے! اس لیے ہر شے (بشمول ابتدائی ارتکاز کے طریقے)

سوشلسٹ گردانی جائے۔ اس طرح روس میں دوسرے درجے کی سرمایہ داری جو ۱۹۱۷ء تک سرمائے کے ابتدائی ارتکاز کی تکمیل میں بھی ناکام رہی تھی، پر سوشلزم لاد دیا گیا۔ اس بات کو مغربی پروپیگنڈہ اور ماہرین سوویت امور نے پکڑ لیا اور اسے آج تک استعمال کر رہے ہیں۔ (بالکل اسی طرح جیسے سماجی و سیاسی امور کے مغربی ماہرین یہ ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہیں کہ نو آبادیاتی سرمایہ داری میں جو خامیاں تھیں اسی وجہ سے پسماندہ ممالک کی انقلابی حکومتوں نے سوشلزم کا انتخاب کیا ہے)۔

لینن نے نئی معاشی پالیسی NEP کو ایک ایسی حکمت عملی سے تعبیر کیا جو کہ ایک پورے تاریخی عبوری دور کے لیے تھی۔ انہوں نے اس حکمت عملی کو ارتکاز کا سب سے معقول معاشی راستہ سمجھا جو کہ موجود پیداواری قوتوں کو تحفظ دیتے ہوئے اسے ترقی دینے پر مبنی تھی۔ جو مسئلہ زیر بحث تھا وہ یہ تھا کہ ابتدائی ارتکاز کی اس مختلف اور بہتر شکل کو پرولتاری ریاست ہتھیا لینے کی بجائے اسے تحفظ دے اور (زمین کی ریاستی ملکیت کی بنیاد پر) کسان کی ذرائع پیداوار پر انفرادی ملکیت کی بنیاد کو ابھارے۔ جزوی طور پر یہ ارتکاز ریاستی سرمایہ داری کی مختلف شکلوں کے ایک نظام (بشمول امداد باہمی کی انجمنوں کوآپریٹیوز کے ذریعے ہونا تھا۔ اسٹالن نے لینن کے انتقال کے فوراً بعد نئی اقتصادی پالیسی NEP کو ایک قلیل المدتی حکمت عملی اور ریاستی سرمایہ داری کو بانجھ قرار دیتے ہوئے اس کی چھٹی کر دی۔ ساتھ ہی اس نے موجود پیداواری قوتوں کو سماجی ملکیت میں لیتے ہوئے (قومیاتے ہوئے) اس پر سوشلزم کا لیبل چسپاں کر دیا۔ اس طرح اسٹالن نے ابتدائی ارتکاز کے لیے سخت ترین انتظامی اور جبری طریقوں سے کام لیتے ہوئے پیداوار کرنے والوں سے ان کی پیداوار ہتھیانے کے طریقے پر عمل درآمد کیا۔

اس ضمن میں اسٹالن کی ہمہ جہتی اجتماعیت کاری COLLECTIVISATION ایک طرح سے آج کے حالات میں "ایشیائی طرز پیداوار" کے کچھ اجزا کی بحالی لگتی ہے۔ مارکس کے ابتدائی ارتکاز میں جس طرح پیداوار کرنے والے کو ذرائع پیداوار سے براہ راست علیحدہ کر دیا جاتا تھا اس کے برعکس ایشیائی طریقہ پیداوار میں کسان سے ذرائع پیداوار اور اشیاء پیداوار رسمی طور پر نہیں بلکہ حقیقی طور پر بیگانہ کیا جاتا ہے۔ ابتدائی ارتکاز کی یہ شکل (ایشیائی طریقہ پیداوار یا اسٹالسنٹ طریقہ) پیداواری قوتوں اور قدرتی وسائل کے لیے انتہائی سخت اور تباہ کن تھا۔ ہم آج بھی اس کے نتائج کو محسوس کر سکتے ہیں۔

ان ایشیائی ممالک کی صورتحال کا تجزیہ کرتے ہوئے جو سوشلزم کی طرف (کسی بھی طرح سے) عبور کی جانب بڑھ رہے ہیں، درج بالا نکات کو ضرور ذہن میں رکھنا چاہیئے۔ لیکن یہ بھی کافی نہیں ہے۔ ایک اور اہم صورتحال جسے قطعاً نظر انداز نہیں کرنا چاہیئے وہ یہ ہے کہ روس کے

برعکس ایشیائی اقوام میں "سرمایہ داری کے تیسرا ماڈل" نے نشوونما پائی جس کی بنیادیں بقیہ دو ماڈلوں سے بہت مختلف ہیں اس لیے کہ اس ماڈل نے نوآبادکاروں کے ذریعے نشوونما پائی۔ نتیجتاً سابقہ نوآبادیاتی اور نیم نوآبادیاتی ممالک کو ورثے میں تین طرح کے ڈھانچے ملے۔

(الف) روائتی ڈھانچوں کی باقیات جو کسی وجہ سے نوآبادیاتی نظام اور ابھرتی ہوئی سرمایہ داری کی زد میں نہیں آئے۔

(ب) نوآبادیاتی ڈھانچہ یعنی اس ڈھانچے کے وہ اجزا جو کہ نوآبادیاتی تقسیم محنت کے تحت نوآبادکار ممالک سے پیوست تھے۔

(پ) قومی سرمایہ دارانہ ڈھانچہ جو کہ نوآبادیاتی نظام کے آخری مرحلے میں اس کی نفی کے طور پر وجود میں آیا۔

یہ وہ مجموعی ڈھانچہ ہے جو ان ممالک کو ایک برادری میں سموتا ہے۔ تاہم وہ چیزیں جو ان ممالک کو ایک دوسرے سے مہمیز کرتی ہیں بھی کچھ کم اہم نہیں ہیں۔ ان سماجی ڈھانچوں میں اوپر بیان کیے گئے اجزا کا مقداری تعلق ہر ملک میں ایک دوسرے سے خاصا مختلف ہیں۔ ان روائتی ڈھانچوں میں جو کہ قدیم اشتراکی سماج سے لے کر اوائیلی جاگیر دارانہ سماج سے تعلق رکھتے ہیں۔ قومی سرمایہ دارانہ سیکٹر کی نمائندگی سرمایہ داری کی ابتدائی اور پختہ دونوں شکلیں کر سکتی ہیں۔ حتی کہ نوآبادیاتی ڈھانچے بھی مختلف تھے۔ کلاسیکی (یعنی خام مال اور خوراک کی چھوٹے پیمانے پر پیداوار اور برآمد) یا جدید (نوآبادیات میں غیر ملکی صنعتی ادارے)۔ ایک ہی تشکیلی رخ کے فریم ورک میں ہی رہتے ہوئے اس چیز نے ان ملکوں کی ترقی کے راستے اور سماجی تبدیلی کے فرق کی خصوصیات کو طے کیا۔

سوشلسٹ پذیر ممالک کی امتیازی خصوصیت یہ تھی کہ قومی سرمایہ دارانہ اور نوآبادیاتی ڈھانچے کے اجزا انتہائی کمزور تھے جبکہ روائیتی ڈھانچے بڑی حد تک بڑے پیمانے پر برقرار تھے۔ روائیتی ڈھانچوں کے برقرار رہنے کا مطلب صرف جاگیردارانہ ڈھانچہ ہی نہیں ہے بلکہ بود و باش اور نفسیات میں ماضی کی باقیات ہیں جو ایشیائی طریقہ پیداوار نے چھوڑیں اور نوآبادیاتی و جاگیردارانہ عہد اقتدار کے تمام اتار چڑھاؤ کے باوجود باقی رہ گئیں۔ یہاں ہمارا مطلب ان ممالک میں کچھ نسلی گروہوں میں عمومی طور پر موجود قبائلی و قدیم اشتراکی دور کے عناصر سے بھی ہے۔ جدید نوآبادیاتی اور مضبوط سرمایہ دارانہ مخالفین کی بجائے ان ممالک میں سب سے بڑی مشکلات یہ روائیتی عناصر کھڑی کرتے ہیں۔ یہ روائیتی اور نیم روائیتی عناصر معاشی سماجیانے ECONOMIC SOCIALISATION کے ڈھانچے میں بہت مشکل سے ڈھلتے ہیں اور ریاستی سرمایہ داری اور معاشی مرکزیت کی راہ میں زبردست مزاحمت کرتے ہیں۔ مزید یہ کہ ان سے

انقلابی قیادت کو یہ شہ ملتی ہے کہ وہ انتہائی سہل اور سادہ ترین طریقوں سے خالص مرکزیت پسند اور محض رسمی طور پر سماجیائے ہوئے ڈھانچے کھڑے کریں۔

بظاہر سہل طریقے یہ وہم پیدا کرتے ہیں کہ ماقبل سرمایہ دارانہ ڈھانچوں سے براہ راست سوشلزم فروغ پاسکتا ہے۔ اس طرح ہمیں سوویت ماڈل پر عمل کرتے ہوئے کسانوں کی اجتماعیت اور اشتمالیت کاری کے ذریعے سوشلزم تعمیر کرنے کی کوششیں نظر آتی ہیں۔ سوشلسٹ پذیر ممالک میں جو سب سے بڑی حماقت سرزد ہوئی ہے وہ ہے عبوری دور میں روائیتی ڈھانچوں کو جلد از جلد ڈھا دینے کی خواہش۔ در حقیقت یہ کام رات بھر میں نہیں کیا جاسکتا۔ باالآخر یہ معاملہ لے دے کر کسانوں کی جبری طور پر جعلی ترقی پسند انقلابی تنظیموں کے ڈھانچوں (بیرک کمیونزم کی تمام شکلیں) کے رسمی بندھن میں باندھ دیا جاتا ہے۔ اس سے ریاست کو دیہاتوں کو کنٹرول کرنے کا ایسا موقع ہاتھ لگتا ہے جس کی نظیر پوری انسانی تاریخ میں ملنا محال ہے لیکن اس سے حقیقی سوشلزم کی جانب سماج کی ترقی کئی عشروں کے لیے رک جاتی ہے۔

در حقیقت ضرورت اس بات کی ہے کہ روائیتی ڈھانچوں کو آہستہ آہستہ تبدیل کیا جائے اور اسے ریاستی سرمایہ داری کے ذریعے چلایا جائے۔ اس مرحلے پر ریاستی مداخلت اور انتظام جنس تجارت کی TURNOVER اور قرضوں کے دائرے تک محدود ہونا چاہیئے۔ آہستہ آہستہ کسان کوآپریٹو محنت کے فوائد سمجھنے لگیں گے جو کہ دوسرے مرحلے کے جوہر پر مشتمل ہوں گے۔ اس عمل کے دوران ہی پبلک سیکٹر میں ارتکاز اور کوآپریٹیوز سے اس کے معاشی رشتے بنیں گے۔ ان دو مرحلوں کے نتیجے میں جدلیاتی طور پر باہمی انحصار والے ڈھانچے وجود میں آئیں گے جو مستقبل کے سوشلسٹ ڈھانچے کی سماجی پیداوار کی تعمیر کریں گے۔ یہ تیسرے مرحلے کے فرائض کی تکمیل کریں گے۔

اس پورے عبوری دور میں سماجی پیداوار کا ڈھانچہ ایک کثیر التشکیلی پیچ میل ساخت کا حامل ہوگا۔ اندازاً یہ ڈھانچہ اس ترتیب سے تشکیل پائے گا۔

ریاستی۔ سوشلزم سے پہلے کے مختلف ڈھانچے۔ پبلک سیکٹر کے لیے ارتکاز۔

اس پورے عبوری دور میں پبلک سیکٹر کی نوعیت نیم سوشلسٹ ہوگی کیونکہ ابتدائی سرمایہ کاری اور تجدید پیداوار REPRODUCTION PROCESS غیر سوشلسٹ سیکٹر میں ارتکاز کی بنیاد پر ہوں گے۔ اس دور میں پبلک سیکٹر میں مقداری توسیع اور اس کی ساخت میں کیفیتی تبدیلی علیحدہ علیحدہ نظر آئے گی۔ نتیجتاً یہ زیادہ سے زیادہ سوشلسٹ ہوتا جائے گا تاکہ تجدید پیداوار کی توسیع عمومی اور کلی طور پر پیداوار کے سوشلسٹ ارتکاز کی بنیاد پر یعنی معاشی طور پر سماجیائے گئے طریقہ پیداوار پر ہوگا۔

اب کچھ بات سوشلسٹ پذیر ممالک اور عالمی سوشلسٹ نظام کے نسبتاً زیادہ ترقی یافتہ ممالک کے مابین معاشی تعاون کے بارے میں بھی ہو جائے۔ ماضی میں کیے گئے اس تعاون کے تنقیدی جائزے کے نتیجے میں بہت ساری خامیاں سامنے آئی ہیں۔ ہم سب پسماندہ سوشلسٹ پذیر ممالک کی جانب سے اپنے سماج میں روائتی ڈھانچوں کو جلد بازی سے توڑنے کے عمل کا مشاہدہ کر چکے ہیں جس کا نتیجہ خاصا خراب نکلا ہے۔ یہ بات اس لیے بھی افسوسناک ہے کہ ان ممالک کے لیے مسائل بھی موجود نہیں رکھتے تھے جو دنیا کی پہلی سوشلسٹ ریاست کو درپیش آئے تھے مثلاً مخاصمانہ محاصرہ وغیرہ۔

معاشی تعاون کے وقت ان ممالک میں موجود مخصوص سماجی ڈھانچوں کے ماڈلوں کو بغور جائزہ اشد ضروری ہے اور ان ڈھانچوں کو تباہ کرنے کی بجائے انہیں آہستہ آہستہ تبدیل کرنا چاہیئے۔ جس چیز کی ضرورت ہے یہ ہے کہ بنیادی اور روائیتی ڈھانچوں سے نکلتے ہوئے معاشی شعبے کی زیادہ سے زیادہ شاخوں کو پروان چڑھایا جائے۔ اگر کسی ملک میں ربڑ پیدا ہوتا ہے تو ضروری ہے کہ پہلے اس کی ابتدائی پروسیسنگ کے کارخانے لگائے جائیں اور ربڑ انڈسٹری بعد میں کھڑی کی جائے۔ یہی بات خوراک اور نقد اجناس کی فصلوں کی پیداوار پر صادق آتی ہے۔

اس سے بہت سے معاشی، سماجی اور کرنسی کے مسائل کو فوری طور پر حل کیا جاسکتا ہے۔ ان شاخوں کی مدد سے انفرادی کسان پیداوار کو ریاستی سیکٹر میں ٹھیکے، قرضوں اور تعاون کے ذریعے شامل کیا جاسکے گا۔ اس عمل کو محنت کی اندرونی تقسیم کے لیئے زیریں ڈھانچے کو تعمیر کرنے کی بامقصد کوششوں سے مزید فروغ حاصل ہوگا۔

بہت سے بورژوا دانشوروں اور سیاستدانوں نے بات چیت کے دوران مجھ سے یہ سوال کیا ہے کہ "کیا سوویت یونین نے سوشلسٹ پذیری کے تصور کو خیرباد کہہ دیا ہے؟" جس کے پیچھے ایک پوشیدہ امید افزا جواب کی خواہش موجود تھی۔ یہ امید مغرب میں پھیلے ہوئے اس یقین کے نتیجے میں پیدا ہوئی ہے کہ پریستروئیکا کے نتیجے میں ہمارے ملک نے سوشلزم کو الوداع کہہ دیا ہے۔

سوشلسٹ پذیری کا ابھرنا اور ایشیا و افریقہ کی کچھ ریاستوں کی یہ خواہش کہ وہ سرمایہ دارانہ ترقی کے پورے عہد کو ایک جست میں پھلانگ کر گزر جائیں اس سے کوئی تعلق نہیں کہ ہم ایسا چاہتے ہیں یا نہیں۔ یہ مظاہر ہماری اطلاع کے بغیر ابھرے ہیں اور ان کی جانب ہمارے داخلی رویے سے آزاد وجود رکھتے ہیں۔ ظاہر ہے بات یہ نہیں ہے کہ ہم سوشلسٹ پذیری کو تسلیم کرتے ہیں یا نہیں۔ بلکہ ہمیں اس کی رو میں بہہ بغیر عالمی تاریخ میں اس کے صحیح مقام کا جائزہ لینا چاہئیے۔ اگر ہم پسماندہ اقوام کے سوشلزم میں عبور کے بارے میں لینن کے نظریے کے بہت سے

نکات کو سامنے رکھیں تو یہ دوبارہ جانچ پڑتال بڑی حد تک سود مند ثابت ہو سکتی ہے۔ اس نظریے سے کم از کم درج ذیل نتائج کا جواز ضرور پیدا ہوتا ہے۔

سرمایہ داری سے ایک سماجی تشکیل کے طور پر کترا کر نکل جانے کا مطلب سرمایہ داری کو مکمل طور پر ختم کرنا ہرگز نہیں ہے۔ انقلابی اقتدار کی ذمہ داری یہ نہیں بنتی کہ سرمایہ داری کو صرف فوجی، سیاسی یا انتظامی طریقوں سے یعنی فرمان نافذ کرنے سے لے ڈھا دے بلکہ لسے چاہیئے کہ وہ اسے لمبی معاشی جدوجہد کے دوران شکست دے۔ ہر ملک کو غیر معاشی جبر EXTRA ECONOMIC COERCION اور انتظام کے معاشی طریقوں کے مابین مخصوص توازن کے تعلق کو دریافت کرنا چاہیئے۔ عموماً عبوری دور کے ابتدائی مراحل میں غیر معاشی جبر خاص طور پر ضروری ہے۔ سماجی پیداوار میں کثیر التشکیلی ڈھانچے رکھنے والے پسماندہ ممالک کے لیئے تو یہ بات بلاشبہ درست ہے۔ معاشی انتظام کے رحجان کے لیئے ضروری ہے کہ وہ آہستہ آہستہ غیر معاشی جبر اور انتظامی۔ نوکر شاہانہ مرکزیت پسندی کے رحجان پر سبقت حاصل کرے۔ (بد قسمتی سے تاریخ نے زیادہ تر اس کے برعکس ثابت کیا ہے)

اس سے ایک اور نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ عبوری دور ایک تدبیری قلیل المدتی مرحلہ نہیں بلکہ اسٹریٹیجک (حکمت عملی) عہد کا نام ہے۔ ناگزیر تاریخی مرحلوں سے چھلانگ لگا کر سوشلزم تک پہنچنے کی کوششیں سوشلسٹ آدرش کو شدید طور پر مسخ کرنے اور کبھی کبھی سوشلسٹ حاصلات کی تباہی پر منتج ہوتی ہیں۔

اور آخر میں لینن کے قول کہ "تھوڑا ہو مگر بہتر ہو" نے آج نہ صرف داخلی سماجی تبدیلیوں کے عمل میں بلکہ عالمی سطح پر بھی اپنی اہمیت نہیں کھوئی۔ صاف گوئی کی بات تو یہ ہے کہ دانشور برادری کا موقف تو یہ ہے (کبھی کبھی آج کل وہ یہ موقف اختیار کرتے ہیں) کہ سرمایہ داری سے پرامن مسابقت میں جتنی زیادہ سوشلسٹ پذیر حکومتیں قائم ہوں بہتر ہے۔

تاریخ نے ثابت کیا ہے کہ "مجموعی پیداوار" GROSS OUTPUT کے تصور نے انقلاب اور معیشت کو زیادہ نقصان پہنچایا ہے اس لیے کہ اس کے قلیل المدتی تدبیری فوائد انقلابی توانائی کو ضائع اور اس کی کیفیتی ترقی کو روک دیتے ہیں اور بعض اوقات سوشلزم کے وقار کو سخت دھچکا پہنچاتے ہیں۔

مختصراً تاریخ نے لینن کی اس فکر کی تصدیق کی ہے کہ نیا نظام صرف اس وقت کامران ہو گا جب وہ سیاسی کامیابیوں کی "مجموعی پیداوار" کی بجائے اعلی صلاحیت اور سماجی و معاشی زندگی کی کوالٹی کو بہتر بنائے۔

ترجمہ۔ مرتضیٰ سولنگی

(ڈاکٹر نوداری سیمونیا مشہور سوویت تاریخ دان ہیں اور ایشیا پر کئی کتابیں اور مضامین لکھ چکے ہیں۔ ان کا یہ مضمون ASIA AND AFRICA TODAY نمبر ۵، ۱۹۸۸ء میں چھپا تھا)۔

پاکستان میں صحت کے شعبہ کے مسائل

اکبر زیدی

اس امر میں کسی شک کی گنجائش نہیں ہے کہ پاکستان میں صحت کا شعبہ مختلف النوع مسائل، رکاوٹوں اور تفادات سے دوچار ہے۔ دیہی علاقوں میں حفظانِ صحت کے وسائل کمیاب ہیں۔ ملک میں ڈاکٹروں کی ایک بڑی تعداد بے روزگار ہے حالانکہ تربیت یافتہ طبی عملہ کی بھی سخت ضرورت ہے، میڈیکل گریجویٹ بڑی تعداد میں ملک سے باہر جا چکے ہیں اور یہ سلسلہ ہنوز جاری ہے، میڈیکل کالجوں سے فارغ التحصیل ہونے والے نئے ڈاکٹر دیہی ماحول میں کام کرنے پر آمادہ نہیں ہیں اور شہری ہسپتالوں میں دستیاب پر تصنع ٹیکنالوجی کے عادی ہوتے جا رہے ہیں، دواساز کمپنیاں ایک عام آدمی کی بہبود کو پیشِ نظر رکھنے کے بجائے دولت لوٹنے میں مصروف ہیں، شہروں میں موجود کچی آبادیاں اور ملک کے دیہی علاقے پینے کے صاف پانی اور نکاسی کے مناسب انتظامات نہ ہونے کی بناء پر پریشان ہیں۔۔۔۔ یہ فہرستِ مسائل مزید طویل ہو سکتی ہے مگر بنیادی حقیقت یہی ہے کہ اس وقت ملک کی اکثریت یا تو حفظانِ صحت کے مناسب وسائل سے بالکل ہی محروم ہے یا ان سے کماحقہ استفادہ حاصل کرنے کی اہلیت اپنے اندر نہیں رکھتی۔ اس صورتحال کا نتیجہ یہ ہے کہ ملک کی اکثریت بیماریوں اور انکے اثرات سے محفوظ نہیں ہے۔

پاکستان میں صحت کے شعبے کے حوالے سے ہمارا بنیادی نقطۂ نظر یہ ہے کہ حفظانِ صحت کے مسائل براہِ راست طور پر مروجہ سماجی، اقتصادی اور سیاسی نظام سے مربوط ہیں جو دیگر شعبہ ہائے زندگی کی طرح صحت کے شعبے میں بھی وسائل کی تقسیم کے ذمہ دار ہیں۔ ہمارے خیال میں یہ

ہمارا طبقاتی نظام ہی ہے جو دیہی علاقوں کے علاوہ شہروں کے گندے و تاریک علاقوں میں صحتِ عامہ سے متعلق مناسب انتظامی ڈھانچے اور سہولتوں کی عدم موجودگی کا موجب ہے۔ نیز ڈاکٹروں کی ان علاقوں میں جا کر کام کرنے سے پہلو تہی کا سبب بھی یہی نظام ہے۔

آئندہ صفحات میں ہم پاکستان میں صحت کے شعبے کے ارتقاء کی مختصر تاریخ بیان کرتے ہوئے اس کے نمایاں پہلوؤں کو اجاگر کرنے کی کوشش کریں گے۔ ہماری یہ بھی کوشش ہوگی کہ ملک کی اقتصادیات کی ان ساختی بنیادوں کی نشاندہی کی جائے جو صحت کے شعبے میں اختیار کردہ موجودہ راہ کی ذمہ دار ہیں۔

پاکستان میں صحت کے شعبے کی تاریخ

۱۹۴۷ء میں قیام پاکستان تک، ہندوستان اور پاکستان دونوں برطانیہ کے زیر تسلط تھے۔ چنانچہ اس وقت تک کی ان دونوں ملکوں کی تاریخ بعض جداگانہ علاقائی خصوصیات کے باوجود ان یکساں رجحانات کی آئینہ دار تھی جو استعماری حکومت کے زیر اثر تشکیل پائے تھے۔ صحت کے شعبے میں بھی یہی صورتحال تھی۔ سوائے اس کے کہ جو علاقے پاکستان میں شامل ہوئے، وہاں مسلم اور عرب طبی روایات کا خاصا گہرا نفوذ تھا۔ برطانوی حکمرانوں کی آمد سے قبل برصغیر میں حفظانِ صحت کے مقامی طریقے رائج تھے۔ ہندوستان کے مشہور ماہر سماجیات دیبابر بینرجی نے لکھا ہے کہ موہنجوڈرو اور وادیٔ سندھ کی قدیم تہذیبوں میں بیماریوں سے تحفظ کے پہلو کو بہت زیادہ اہمیت دی جاتی تھی جو صحت کے حوالے سے اس معاشرے کے پختہ رویّے کی نشاندہی کرتی ہے۔ جوں جوں ہندوستان بیرونی اقوام اور ثقافتوں کے زیرِ اثر آتا گیا ویسے ویسے نئے سماجی اور سیاسی نظام وضع ہوتے چلے گئے۔ حفظانِ صحت اور طب کا نظام بھی ان اثرات سے محفوظ نہیں رہا۔ عرب اور مغل اپنے ساتھ جو طبی تکنیک لے کر آئے وہ آج بھی پاکستان میں کسی حد تک مقبول ہے۔ ہندوستان میں انگریز کی آمد کے وقت حفظانِ صحت کا مقامی نظام اپنی ترقی یافتہ شکل میں موجود تھا اور اہلِ مغرب کے درآمد کردہ نظام سے آسانی کے ساتھ مقابلہ کر سکتا تھا۔

انگریز کی آمد کے ساتھ ہی ہندوستانی زندگی کے جملہ پہلو بشمول طب اور صحت عامہ کے نظام کے، لندن میں قائم استعماری حکومت کے تجارتی، سیاسی و انتظامی مفادات کے نہیہ دام آ گئے۔ انگریز اپنے ہمراہ جو مغربی طریقۂ علاج لے کر آیا تھا وہ بنیادی طور پر اس کے اپنے انتظامی و فوجی افراد کی ضروریات کی تکمیل کرتا تھا۔ ان لوگوں کے علاوہ انگریز نے ہندوستان کی مقامی اشرافیہ کو بھی اس بات کا موقع فراہم کیا کہ وہ بھی اس جدید طبی نظام سے استفادہ کرے۔ آزادی کے بعد بھی اس نظام کا تسلسل جاری رہنے اور صرف متمول اور حکمران طبقات ہی کو مناسب طبی

سہولتوں تک رسائی حاصل ہے۔ انگریز نے اس کے ساتھ ساتھ اس اشرافیہ میں سے منتخبہ افراد کو انتظامیہ، افسر شاہی اور ڈاکٹروں کے طور پر کام کرنے کا بھی موقع فراہم کیا تاکہ وہ سامراجیوں کے شانہ بشانہ کام کر سکیں۔ چنانچہ جب انگریز ہندوستان اور پاکستان سے رخصت ہوا تو اس وقت تک لئے اس امر کا یقین ہو چکا تھا کہ یہاں کے پورے نظامِ حفظانِ صحت پر قابل لحاظ اثر و رسوخ چھوڑ کر جا رہا ہے اور طب کے شعبے کا چوٹی کا حصہ ان پر انحصار پر مجبور ہے۔ صرف صحت کے شعبے ہی میں نہیں بلکہ سول، ملٹری اور انتظامی سروسوں کا سارا کا سارا ڈھانچہ ہی انگریزوں سے مقامی کالے انگریزوں BROWN ENGLISHMEN کو منتقل ہوا تھا۔

آزادی کے بعد پاکستان کے نئے حکمران طبقے نے اپنے استعماری آباء ہی کی حکمت عملیوں کو جاری رکھا۔ انگریز نے ہندوستان کے مقامی اور ثقافتی سرمائے کا استحصال کرتے ہوئے ایسے ادارے (بشمول ان کے جو حفظانِ صحت سے متعلق تھے) قائم کئے تھے جو اس کے وسیع تر مفادات کی تکمیل کرتے تھے۔ جو بات قابلِ توجہ ہے وہ یہ ہے کہ "آزاد" پاکستان کے حکمرانوں نے بھی انہیں حکمت عملیوں کو جاری رکھا جو استعمار کی ضروریات کی تکمیل کیلئے وضع کی گئی تھیں۔ پاکستان کے عوام کے حقیقی مسائل سے عہدہ برا ہونے کے لیے کوئی اقدامات نہیں کئے گئے۔ آزادی کے وقت (اور اب بھی) ملک کے بہترین ہسپتالوں اور ڈاکٹروں تک رسائی صرف اشرافیہ ہی کا حق تھا۔ جبکہ عوام کو ناقص سرکاری ہسپتالوں ہی پر اکتفا کرنا پڑ رہا ہے خواہ وہ شہری ہسپتالوں کے "بیرونی مریضوں کے شعبے" ہوں یا نام نہاد دیہی مراکزِ حفظانِ صحت یا بنیادی صحت کے یونٹ ہوں۔

اس وقت پاکستان میں نظام صحت کی صورتحال کو آسان الفاظ میں یوں بیان کیا جاسکتا ہے کہ یہ نظام بہت زیادہ غیر مساویانہ ہے اور مغربی حفظانِ صحت کا نمونہ ہے جو یقیناً ہمارے ملک کے عوام کی بہت بڑی تعداد کی ضروریات کو پورا نہیں کرتا۔ آئیے اب مروجہ نظام صحت کے نمایاں پہلوؤں اور مسائل کا جائزہ لیں۔

شہری اور طبقاتی تعصبات

پاکستان میں صحت کی سہولتوں کی تقسیم پر سرسری سی نگاہ ہی ڈالیں تو ایک بڑی حیران کن تصویر سامنے آتی ہے۔ اس حقیقت کے باوجود کہ ہماری آبادی کا ستر فی صد دیہی علاقوں میں رہتا ہے، طبی سہولتوں اور عملہ کا ارتکاز شہروں میں ہے۔ مثلاً پچاسی (۸۵) فی صد برسرِ روزگار ڈاکٹر شہروں میں پائے جاتے ہیں اور شہروں میں ڈاکٹر بمقابلہ آبادی کا تناسب (نظری اعتبار سے) ایک، اور اٹھارہ سو ایک (۱:۱۸۰۱) ہے۔ اس کے برعکس دیہی علاقوں میں ڈاکٹر اور آبادی کا تناسب ایک اور پچیس ہزار آٹھ سو انتیس (۱:۲۵۸۲۹) ہے۔ سندھ میں جو کہ آبادی کے لحاظ سے

ملک کا دوسرا بڑا صوبہ ہے، دیہی علاقوں میں ڈاکٹر اور آبادی کا تناسب ایک اور ستاون ہزار نو سو

چونسٹھ (۵۷۹۶۴:۱) ہے۔ اگر یہ اعداد و شمار حیران کر دینے والے ہیں تو مزید حیران کن سندھ میں نرسوں اور آبادی کا تناسب ہے۔ یہاں پانچ لاکھ، اڑسٹھ ہزار چھپن افراد کی تیمار داری کے لیے ایک نرس میسر ہے۔ اس طرح ملک کے صرف تیئس فی صد (۲۳%) ہسپتال دیہی علاقوں میں ہیں اور ساٹھ ملین (چھ کروڑ) آبادی کے لیے محض آٹھ ہزار سات سو چوّن (۸۷۵۴) بستر (یعنی کل بستروں کا اٹھارہ فی صد) میسر ہیں۔

مذکورہ بالا رجحان کو ایم لپٹن نے جو کہ عمرانی علوم کے ایک اہم ماہر سمجھے جاتے ہیں، "شہری تعصب" یا "شہری میلان" کا نام دیا ہے۔ ہر چند کہ ہم اس نظریاتی اساس کو قابلِ قبول تصور نہیں کرتے جو لپٹن نے اپنے اس تصورِ شہری تعصب کو فراہم کی ہے (لپٹن کا خیال ہے کہ دیہی آبادی کے خلاف شہری آبادی گویا کوئی سازش کرتی ہے۔ نیز وہ تقسیمِ وسائل کی کشمکش کو شہری اور دیہی "علاقوں" کے درمیان کشمکش تصور کرتے ہیں) تاہم "شہری تعصب" یا "شہری میلان" کی اصطلاح اپنی جگہ ایک خاص رجحان کو واضح کرنے کیلئے کار آمد ضرور ہو سکتی ہے۔ یہ بات بالکل واضح ہے کہ یہ تعلیم کا شعبہ ہو یا صحت کا، ایک طرح کا "شہری تعصب" ان میں بہرحال پایا جاتا ہے جو دیہی علاقوں میں سہولتوں کی کمیابی اور دیہی باشندہ کے ساتھ روا رکھے جانے والے امتیازی سلوک کی صورت میں منعکس ہوتا ہے۔

تیسری دنیا کے ممالک میں شہری تعصب کے مختلف النوع اسباب ہیں۔ سب سے پہلے تو یہی کہ حکمران طبقہ شہروں میں سکونت پذیر ہے۔ اس حقیقت کا اطلاق زرعی معاشروں پر بھی ہوتا ہے جہاں فیوڈل ڈھانچے کے باوجود زمینداروں کی ایک بڑی تعداد "غیر حاضر زمینداروں" کی ذیل میں آتی ہے جو صنعتی اور تجارتی اشرافیہ کی طرح شہروں میں رہتی اور "ترقی" کے ثمرات سے لطف اندوز ہوتی ہے۔

دوئم، تیسری دنیا کے بیشتر ممالک میں شہر ہی حکومتوں کے مراکز بھی ہوتے ہیں۔ حکمران طبقے کے علاوہ، حکومت کے اراکین، افسر شاہی اور فوجی افسران، شہری علاقوں ہی میں رہائش پذیر ہوتے ہیں اور انہیں کو اپنی طاقت کا سرچشمہ بناتے ہیں۔ چنانچہ ان افراد کی ضروریات کے لیے شہروں میں انتظامی ڈھانچہ تشکیل دیا جاتا ہے۔ سوئم، منظم، موثر اور سیاسی اعتبار سے متحرک گروپ مثلاً ٹریڈ یونینیں، طلبہ اور پیشہ ور افراد یہ سب شہروں ہی میں اپنے وجود کو زیادہ موثر طور پر محسوس کراتے ہیں اور بوقتِ ضرورت اپنے مطالبات کے حصول کے لیے پریشر گروپوں کے طور پر عمل کرتے ہیں۔

مختصراً ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ تیسری دنیا میں کیونکہ غالب طبقات شہروں میں مکین ہیں لہٰذا بہترین سہولتیں بھی یہیں پائی جاتی ہیں۔ اسی طرح شہروں میں ایسے عناصر بھی پائے جاتے ہیں جو حکومت پر دباؤ ڈالنے کی اہلیت رکھتے ہیں۔ خود حکومت بھی ان کو صحت اور دیگر بنیادی وسائل فراہم کر کے مطمئن کرنے کی کوشش کرتی ہے۔

مذکورہ بااثر حلقے قیامِ پاکستان سے پہلے بھی شہروں میں رہتے تھے۔ چنانچہ جب کوئی انگریز کی صحت عامہ سے متعلق حکمت عملیوں کا جائزہ لیتا ہے تو وہاں بھی وہی "شہری تعصب" نظر آجاتا ہے۔ حکومت خواہ برطانوی استعمار کی ہو یا آزاد پاکستان کی، مختلف النوع پابندیوں کے اندر کام کرتی ہے۔ جن میں سے ایک پابندی یہ ہے کہ حکمران طبقے اور دیگر زور آور حلقوں کو خوش اور مطمئن رکھا جائے۔ چنانچہ آج تک جو بھی حکومتیں آئی ہیں خوہ وہ جائز طریقے سے آئی ہوں یا ناجائز سے، سب نے اپنے منصوبوں میں "شہری تعصب" کا مظاہرہ کیا ہے۔ مثال کے طور پر باوجود اس زبانی وعدے کی تکرار کے کہ شہری و دیہی علاقوں میں بہم وسائل میں توازن پیدا کیا جائے گا (جو کہ پنج سالہ و دیگر منصوبوں سے متعلق دستاویزات کا ایک عام مضمون ہے) حقیقت میں آزادی کے بعد سے اب تک کوئی بنیادی تبدیلی واقع نہیں ہوئی ہے۔ تمام ترلفاظی کے باوجود آخر کار ہوا یہی ہے کہ صحت کے شعبے سے متعلق بجٹ کا (جو کہ پہلے ہی بہت کم ہے) اسی فی صد (جو کہ کل قومی پیداوار کا ایک فیصد سے بھی کم ہے) شہروں میں موجود حفظانِ صحت کے وسائل کو فراہم کیا جاتا ہے اور دیہی علاقوں کے صحت عامہ کے پروگرام نظر انداز کئے جا رہے ہیں۔ دیہی علاقوں میں تربیت یافتہ طبی عملے کی کمیابی کا ایک اہم سبب ان علاقوں میں وسائل کی کمیابی ہے۔ اگر کچھ با ارادہ ڈاکٹر دیہی علاقوں میں جا کر کام کرنا بھی چاہیں تب بھی وہاں کی انتہائی ناگفتہ بہ صورتحال انہیں اپنا ارادہ ترک یا تبدیل کر دینے پر مجبور کر دیتی ہے۔ مزید براں حکومت اس وقت بڑی سادہ لوحی کا مظاہرہ کرتی ہے جب ڈاکٹروں کے دیہی علاقوں میں جانے پر اصرار کرتی ہے مگر انہیں وہاں اس سے بھی کم معاوضہ پیش کرتی ہے، جتنا شہری علاقوں کے ڈاکٹروں کو دیا جاتا ہے۔

لپٹن کے نظریۂ "شہری تعصب" پر ہمارا اعتراض یہ ہے کہ حالانکہ یہ تعصب "ظاہر و باہر" ہے تاہم ایک اور تعصب بھی وجود رکھتا ہے جو زیادہ گہرا اور بنیادی نوعیت کا حامل ہے۔ یہی نہیں بلکہ جو صحت کے وسائل تک رسائی کے ضمن میں فیصلہ کن کردار ادا کرتا ہے۔ یہ تعصب ہے۔۔۔۔ طبقاتی تعصب۔ حقائق ہمیں یہی باور کراتے ہیں کہ خود شہروں کی ساری کی ساری آبادی بھی وسائلِ صحت تک رسائی کے معاملے میں یکساں طور پر مستفید نہیں ہوتی۔ نہ ہی دیہی علاقوں کے تمام ہی افراد امتیازی سلوک کا نشانہ بنتے ہیں۔ ایک فیوڈل لارڈ کے لیے اچھی صحت کا حصول، کسی بڑے شہر کی کچی آبادی کے باسیوں کے مقابلے میں کہیں زیادہ آسان و سہل ہے۔

کسی شہر کی پسماندہ بستی کا مکین ان معنوں میں تو "بظاہر" رسائی رکھتا ہے کہ اسے معلوم ہوتا ہے کہ اس کے شہر میں علاج معالجے کے کون کون سے وسائل موجود ہیں مگر ان وسائل سے اور پرائیویٹ ہسپتالوں کے انتہائی مہنگے علاج سے استفادے کی اہلیت اس میں نہیں ہوتی۔ اس کے ساتھ ساتھ سرکاری ہسپتالوں کے بیرونی مریضوں کے شعبے او پی ڈی میں جہاں ایک ڈاکٹر کے پاس فی مریض ساٹھ سیکنڈ سے بھی کم وقت ہوتا ہے، علاج کا معیار اپنی جگہ مشتبہ ہے۔ اسی طرح شہروں کے اندر رہنے والوں کے درمیان بھی علاج تک رسائی کے نقطۂ نظر سے بڑا فرق پایا جاتا ہے۔ جو اہلِ زر ہیں وہ "بہترین اور جدید ترین" ٹیکنالوجی سے مستفید ہونے کی استطاعت رکھتے ہیں جبکہ اکثریت جس میں کچی بستیوں کے باشندے شامل ہیں انگنت رکاوٹوں سے دوچار ہیں۔

چنانچہ ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ باوجود اس کے کہ ظاہر میں ایک "شہری تعصب" ہمیں نظر آتا ہے لیکن جغرافیائی تقسیم سے قطع نظر، درحقیقت یہ طبقاتی تقسیم ہے جو صحت عامہ کے وسائل تک رسائی کے ضمن میں فیصلہ کن کردار ادا کرتی ہے۔

میڈیکل کی تعلیم و تربیت

میڈیکل کی تعلیم کا مقصد ایسا طبی عملہ تیار کرنا ہوتا ہے جو ملک کے مروّجہ طبی نظام میں مؤثر طور پر کام کر سکے۔ چنانچہ پاکستان میں چھ سات سال کی تربیت کے بعد میڈیکل کالجوں سے جو ڈاکٹر بن کر نکلتے ہیں انہیں مذکورہ بالا نظام ہی میں رہ کر کام کرنا ہوتا ہے یعنی ایک ایسے نظام میں جو "شہری تعصب" کا حامل ہے اور دوسرے یہ کہ جو ملک کی امیر آبادی کے مفادات کے پیش نظر بنایا گیا ہے۔

پاکستان میں میڈیکل کالجوں میں طلبہ کو وہ کتابیں پڑھائی جاتی ہیں جو ترقی یافتہ ملکوں کی ضروریات کو پیش نظر رکھ کر لکھی گئی ہیں۔ لہٰذا ہمارے طلبہ جن امراض کے بارے میں علم حاصل کرتے ہیں وہ ترقی پذیر قوموں کے بجائے عموماً ترقی یافتہ قوموں سے مخصوص ہیں۔ مثال کے طور پر وہ ان کتابوں سے یہ اخذ کرتے ہیں کہ امراضِ قلب اور کینسر، موت کے سب سے بڑے اسباب ہیں جبکہ پاکستان میں اصل صورتحال یہ ہے کہ چوّن فی صد (۵۴%) اموات چھوت اور متعدی INFECTIOUS امراض کی وجہ سے واقع ہوتی ہیں۔ جبکہ امیر اور مغربی ممالک کی عام بیماریاں (مثلاً دل کے امراض اور کینسر) ہمارے یہاں محض دو فی صد اموات کا موجب بنتی ہیں۔(٦) تدریس کے طریقے اور کتابیں، ہمارے طلبہ پر ایسا گہرا اثر ڈالتے ہیں کہ وہ یہی سمجھتے ہیں کہ ان کے ملک میں بھی اموات کی ایک اہم وجہ امراضِ قلب ہیں۔

نہ صرف یہ کہ امراض کی تشخیص مغربی حوالوں سے کی جاتی ہے بلکہ حفاظتی اقدامات اور

علاج معالجہ بھی اسی نقطۂ نظر سے ہوتا ہے۔ عموماً ترقی پذیر ملکوں میں، ترقی یافتہ ملکوں کے طریقۂ علاج اور ادویات کی نقالی کی جاتی ہے جس میں شہروں میں موجود ہسپتالوں کو مرکزی اہمیت حاصل ہوتی ہے۔ تدریسی عملہ اس ثقافتی استعماریت کو پختہ تر بنانے میں معاونت کرتا ہے۔ پروفیسر صاحبان تربیت کیلئے مغربی ملکوں میں جاتے ہیں اور اپنے طلبہ کو بھی آمادہ کرتے ہیں کہ وہ ان ملکوں میں جا کر نیورو سرجری اور پلاسٹک سرجری جیسے شعبوں میں تربیت حاصل کریں۔ جب (اگر) یہ ڈاکٹر واپس ملک آتے ہیں تو وہ اپنے ملک کے عوام سے اور زیادہ بیگانہ اور دور ہو چکے ہوتے ہیں۔ اوّل تو ان عام بیماریوں ہی سے اب کوئی خاص تعلق نہیں رکھتے جو غریبوں میں عام ہوتی ہیں مثلاً تپِ دق اور تبخیرِ معدہ GASTRO ENTERITIS وغیرہ۔ اس کے برعکس وہ امیروں کی بیماریوں کا علاج کرنے کے لیے زیادہ اہل بن چکے ہوتے ہیں۔ دوسری اور اہم تر بات یہ ہے کہ مغربی تربیت یافتہ ڈاکٹروں سے محض وہ محدود لوگ ہی علاج کروا سکتے ہیں جو ان کی بڑی بڑی فیسیں ادا کر سکتے ہوں۔

پاکستان جیسے ترقی پذیر ملک میں جہاں بیشتر امراض متعدی قسم کے ہوتے ہیں اور جن سے بچاؤ کے لیے حفاظتی تدابیر کو بہت زیادہ اہمیت حاصل ہے، میڈیکل کی تعلیم کا زور بھی اس بات پر ہونا چاہیئے کہ ایسے ڈاکٹر تیار کئے جائیں جو حفظانِ صحت کی بنیادی تکنیک پر عبور رکھتے ہوں۔ اس کے برعکس ہمارے یہاں میڈیکل تعلیمی اداروں میں کمیونٹی میڈیسن کے مضمون کو طلبہ و اساتذہ دونوں بہت سرسری طور پر لیتے ہیں۔ اکثر ایسی مثالیں بھی دیکھنے میں آئی ہیں کہ باقاعدہ سند یافتہ ڈاکٹر بعض بالکل سادہ اور عام سے مسائل مثلاً سانپ کے کاٹے جیسے عمومی مسئلے سے بھی نہیں نمٹ سکے۔ میڈیکل کے طلبہ کی تمام تر تعلیم و تربیت ان مریضوں کے مشاہدے تک محدود ہوتی ہے جو ان کے پاس شہروں کے ہسپتالوں میں علاج کی غرض سے آتے ہیں۔ گویا ان کا زور ادویات استعمال کرانے پر ہوتا ہے نہ کہ بیماریوں سے بچاؤ کی تدابیر پر۔

اس نامناسب طبی تعلیم کی وضاحت بڑی سادہ سی ہے۔ کیونکہ صحت کے شعبے کی جملہ حرکیات کا تعین حکمران طبقہ کرتا ہے لہٰذا یہی طبقہ ایک مخصوص قسم کے ڈاکٹر کی تیاری کا بھی ذمہ دار ہے۔ حکمران طبقے کو ضرورت ایک ایسے ہی ڈاکٹر کی ہے جو باوسائل مریضوں کے ان امراض کے علاج کی اہلیت رکھتا ہو جو ترقی یافتہ ملکوں میں عام ہیں۔ نتیجتاً میڈیکل کالجوں کا نصاب اسی ہدف کو سامنے رکھ کر تشکیل دیا جاتا ہے۔ اس قسم کے نظامِ تعلیم کا ایک اہم نتیجہ ڈاکٹروں کا مشرف بہ مغربیت ہو جانا ہے۔ کیونکہ ڈاکٹروں کو مغرب میں پائی جانے والی بیماریوں ہی کے بارے میں تعلیم دی جاتی ہے لہٰذا یہ ڈاکٹر مغربی ممالک کے ہسپتالوں میں وہاں کے ماحول اور طریقۂ کار سے ضروری واقفیت کے بعد باآسانی کھپ جاتے ہیں۔ اس وقت پاکستان سے فارغ

التحصیل ڈاکٹروں کی تقریباً پچاس فی صد (۵۰%) تعداد بیرونِ ملک کام کر رہی ہے۔ اگر ہمارا نصاب ملک کے غریب باشندوں کی ضروریات کو پیش نظر رکھ کر وضع کیا جاتا اور اس میں دیہی علاقوں اور شہروں کے خستہ حال محلوں کے حالات کو پیش نظر رکھا جاتا تو یہ مسئلہ درپیش نہ ہوتا۔ اس وقت صورتِ حال یہ ہے کہ مذکورہ بالا نظام تعلیم اور ڈاکٹروں کی بیرونِ ملک ہجرت کے نتیجے میں گویا ترقی پذیر ممالک، مغربی ممالک کی مدد کر رہے ہیں!

ڈاکٹروں کی بے روزگاری

ملک کی عظیم اکثریت کی صحت کی ابتر صورتحال کے پیش نظر کوئی بھی شخص یہ سوچ سکتا ہے کہ ہمارے ہاں ڈاکٹروں کی بے روزگاری کا تو کوئی مسئلہ ہی پیدا نہیں ہونا چاہیئے۔ لیکن امرِ واقعہ یہ نہیں ہے۔ حکومت کے ذرائع کا کہنا ہے کہ اس وقت ملک میں گیارہ ہزار ڈاکٹر بے روزگار ہیں۔ ایک جانب ملک میں ڈاکٹروں کی بے روزگاری کا یہ عالم ہے اور دوسری طرف پاکستان میں امواتِ نوزائیدگان (INFANT MORTALITY) کا تناسب ۱۲۵ فی ہزار ہے۔ آبادی اور ڈاکٹر کے تناسب کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے کہ صرف دیہی سندھ میں ستاون ہزار نو سو چونسٹھ (۵۷۹۶۴) افراد کے لیے ایک ڈاکٹر میسر ہے۔

ڈاکٹروں کی بے روزگاری کا مسئلہ برسہا برس سے پروان چڑھ رہا ہے اور اب یہ اپنی انتہا کو پہنچ چکا ہے۔ ماضی میں حکومتوں کی جو پالیسیاں رہی ہیں ان کے پیش نظر اس بحران کو بہت پہلے دیکھ لیا جانا چاہیے تھا۔ حکومتوں پر، شہروں میں مرتکز علاج کی حکمت عملی کا سودا سمایا رہا ہے اور وہ ایسے میڈیکل تعلیمی ادارے بنانے میں منہمک رہیں جو اس نظام کے ستون یعنی "ڈاکٹر" کی تعمیر کر سکیں۔ اس طرز فکر نے اب الٹا وار کیا ہے۔ ان سب ڈاکٹروں کی کھپت کے لئے مناسب ڈھانچے کی عدم موجودگی نے بڑی تعداد میں ڈاکٹروں کو بے مصرف اور بے روزگار بنا کر چھوڑ دیا ہے۔ اگر ابتدا ہی سے ہمارے یہاں ایک متوازن طرز عمل کو اختیار کیا جاتا، نیز وسائل کی تقسیم، آبادی کی تقسیم کی مناسبت سے کی جاتی تو ڈاکٹروں کا یہ جم غفیر ہاتھ پہ ہاتھ دھرے نہ بیٹھا ہوتا بلکہ بہت سے ڈاکٹر شہروں سے دیہات کا رخ کرنے میں بھی تامل نہ کرتے۔ آج صورتحال بلاشبہ افسوسناک ہے کہ ملک میں ڈاکٹروں کی قلت بھی ہے اور خود حکومت ڈاکٹروں کو مشرقِ وسطی جا کر ملازمت تلاش کرنے کا مشورہ دے رہی ہے۔

ادویہ ساز ادارے

اکثر ترقی پذیر ملکوں میں کثیر القوی کارپوریشنوں کے کردار پر سخت تنقید کی جاتی ہے۔

اس کے اسباب عام طور پر ایک جیسے ہیں یعنی کثیر القومی کارپوریشنیں جتنی سرمایہ کاری کرتی ہیں اس سے کہیں زیادہ منافع کماتی ہیں۔ پھر اکثر صنعتی شعبوں میں ان کی اجارہ داری قائم ہوجاتی ہے۔ یہی نہیں بلکہ وہ سیاسی اثر ورسوخ بھی حاصل کرتی ہیں اور حکومتوں پر اثر انداز ہونے کی کوشش کرتی ہیں تاکہ ان کی سرمایہ کاری کو تحفظ میسّر رہے۔

پاکستان میں ساڑھے سات ہزار سے زیادہ ادویات تیار کی جاتی ہیں جبکہ عالمی ادارۂ صحت کی تجویز یہ ہے کہ ترقی پذیر ملکوں میں دوسو پچاس ادویات وہاں کی ضروریات کے لئے کافی ہیں۔ یہ امر قابل ذکر ہے کہ پاکستان کی پچپاسی فی صد ادویات پندرہ کثیر القومی کارپوریشن کے تحت تیار ہوتی ہیں۔

اس صورتحال کے دو اسباب ہیں جو ترقی پذیر ملکوں میں بہت عام ہیں۔ اولاً یہ کہ ایک ایسے ملک میں جہاں علاج کا دارومدار "ڈاکٹر" پر ہو، دوا کی خیرات اسکے نظام کا لازمی حصّہ بن جاتی ہے۔ اس نظام میں لازمی ہے کہ ڈاکٹر کے سامنے طرح طرح کی دواؤں کا انبار ہو تاکہ وہ مریضوں کے سپرد کرسکے۔ اسکے برعکس اگر ملک میں نظام طب بیماریوں سے بچاؤ کی تدابیر کی بنیاد پر قائم کیا جاتا اور "علاج قبل از بیماری" کو بنیادی اصول قرار دیا جاتا تو دواؤں کی طلب کم ہوسکتی تھی اور بیماریوں سے بچاؤ سستا ثابت ہوتا۔ کثیر القومی کمپنیوں کے ترقی پذیر ممالک میں مسلسل تسلط کا دوسرا سبب وہ تعلق اور رابطہ ہے جو یہ ادارے ڈاکٹروں کے حلقوں اور ریاستی بیوروکریسی کے ساتھ قائم رکھتے ہیں۔ بہت سی کثیر القوی کمپنیاں عالمی سطح کے سیمنار منعقد کرتی ہیں جنکا بظاہر مقصد میڈیکل سائنس کی ترویج قرار دیا جاتا ہے مگر جو درحقیقت انکی اپنی تیار کردہ دواؤں کی تشہیر کا ذریعہ ہوتے ہیں۔ بہت سے ملکوں میں ڈاکٹروں کو مخصوص ادویات کو فروغ دینے پر مختلف طریقوں سے نوازا جاتا ہے۔ بیوروکریسی کے ساتھ رابطوں کا مقصد ادویات کی تیاری اور قیمتوں کے تعین کے حوالے سے انکے ہمدردانہ روّیے کو یقینی بنانا ہوتا ہے۔

پاکستان میں ادویہ سازی کی صنعت کے موضوع پر بہت کم تحقیق ہوئی ہے اور ضرورت اس بات کی ہے کہ دانشور حضرات اس اہم کام کی انجام دہی کے لئے خود کو آمادہ کریں اس سلسلے میں صرف یہی کافی نہیں ہے کہ کثیر القومی دواساز اداروں کی سالانہ آمدنیوں کا کھوج لگایا جائے بلکہ یہ بھی ضروری ہے کہ یہ دیکھا جائے کہ یہ ادارے اپنے مفادات کی ترویج کے لئے کس قسم کے غیر اخلاقی ذرائع استعمال کرتے ہیں۔

کیا ۲۰۰۰ء تک صحت کی سہولت عام ہوگی؟

۱۹۷۸ کا سال حفظان صحت کے شعبے کے لئے ایک انقلابی سال کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس

سال دنیا کے ایک سو تیس ممالک نے ایک اعلان نامے پر دستخط کئے جس میں یہ فیصلہ کیا گیا تھا کہ یہ ممالک موجودہ صدی کے آخر تک اپنے اپنے عوام کی مناسب بہبودئ صحت کو یقینی بنا چکے ہوں گے۔ الما آٹا ALMAATA کے اس اعلان نامے پر پاکستان کے دستخط بھی ثبت ہیں۔

اس اعلان نامے کو جاری ہوئے گیارہ سال ہو چکے ہیں اور موجودہ صدی کے اختتام میں ۱۱ سال باقی رہ گئے ہیں۔ تاہم کوئی بھی غیر جانبدار شخص پاکستانی عوام کی صحت کی صورتحال پر مایوسی کا اظہار کیے بغیر نہیں رہ سکتا۔ گذشتہ گیارہ سال میں نہ صرف یہ کہ اس صورتحال میں کوئی نمایاں تبدیلی واقع نہیں ہوئی ہے بلکہ موجودہ حالات میں صحت کے شعبے میں آئندہ ۱۱ برسوں میں کسی بامعنی تبدیلی کی توقع بھی مشکل ہے۔ موجودہ کجرو نظام صحت میں زیادہ سے زیادہ چند نمائشی تبدیلیوں کی توقع تو شاید کی جاسکتی ہے مگر پورے نظام کی تشکیل نو کے کوئی آثار دکھائی نہیں دیتے۔

زیر نظر مضمون میں ہم نے تکرار کے ساتھ یہ دلیل دی ہے کہ نظام صحت ملک میں مروج سماجی، اقتصادی و سیاسی نظام ہی کا عکس ہوتا ہے۔ اگر ایک محدود حکمران طبقہ ملک کے کل وسائل پر کنٹرول رکھتا ہو اور عوام کی شرکت محدود یا مفقود ہو تو صحت کا شعبہ بھی اس رجحان کی عکاسی کرے گا اور صحت بھی "سب" کے بجائے "چند" کا حق قرار پائے گی۔ صحت کے میدان میں انقلاب کے لئے معاشرے میں انقلاب ناگزیر ہے۔ سوشلسٹ معاشروں کا تجربہ یہ ظاہر کرتا ہے کہ اگر ایک مرتبہ معاشرے میں تقسیم وسائل کا اسلوب بدل دیا جائے تو صحت کے شعبے کا نظام بھی بدلنا ممکن ہو جاتا ہے اور صحت تک رسائی کے حقوق ہر کسی کو میسر آجاتے ہیں۔ سوشلسٹ ممالک کے علاوہ بعض ایسے ممالک بھی ہیں جو سوشل ڈیموکریسی کے حامل ہیں اور عوامی شرکت کی ایک تاریخ رکھتے ہیں وہ بھی اپنے باشندوں کو صحت کی مناسب سہولتیں فراہم کرنے میں کامیاب رہے ہیں۔ چنانچہ پاکستان میں صحت کے شعبے میں کسی قابل ذکر بہتری کی توقع اس وقت تک نہیں کی جاسکتی جب تک کہ اقتدار کے موجودہ ڈھانچے میں بنیادی تبدیلی اور عوام کی شراکت یقینی نہیں بن جاتی۔

اختتامیہ

سماجی تبدیلی کے حوالے سے مندرجہ بالا سطور میں جو نتائج اخذ کئے گئے ہیں ان میں ہمارے ملک کے اہل دانش اور ماہرین سماجیات کے لئے کیا پیغام موجود ہے؟ ہمارے خیال میں تاریخ نے ہم پر اپنے ملک اور معاشرے کے حوالے سے عظیم ذمہ داریاں عائد کر دی ہیں۔ اگر ہم اپنے ضمیر کے سامنے سرخرو ہونا چاہتے ہیں تو ہمیں ان ذمہ داریوں سے عہدہ برا ہونا ہوگا۔ ہمارا فرض ہے کہ ہم اپنے غیر منصفانہ نظام کی عدم مساوات کا پردہ چاک کریں۔ ہمیں سچ کی تلاش کرنی چاہیے اور اس سچ کو

فروغ دینا چاہیے اور زیادہ سے زیادہ لوگوں کو یہ بتانا چاہیے کہ وہ کون کون سے ناسور ہیں جو ہمارے معاشرے میں پل رہے ہیں۔ ہمیں معاشرے میں تبدیلی کے لئے ہر ممکن تدبیر کرنی چاہیے اور ایک ایسے نظام کی تشکیل کے لئے کوشاں ہونا چاہیے جس میں سب کے لئے شرکت و شمولیت کے مساوی مواقع میسر ہوں۔ تب ہی ہم ایک ایسے نظام کے حصول میں بھی کامیاب ہو سکیں گے جو ہر فرد و بشر کی صحت کی ضمانت دے سکتا ہو۔

ترجمہ: سید جعفر احمد

یہ مضمون، مصنف کی حال ہی میں شائع ہونے والی تصنیف میں پہلے باب کے طور پر شامل ہے۔ مضمون میں اٹھائے گئے نکات کے تفصیلی مطالعے کے لئے اس کتاب کو دیکھا جاسکتا ہے۔ The Political Economy of Health Care, Vanguard, Lahore, 1988.

(اکبر زیدی کراچی یونیورسٹی میں اسسٹنٹ پروفیسر ہیں)

پاکستان اکیسویں صدی کی دہلیز پر

سید جعفر احمد

اکیسویں صدی کا سورج طلوع ہونے میں گیارہ سال باقی رہ گئے ہیں۔ نئی صدی کے آغاز پر پاکستان کس حال میں ہوگا۔

گیارہ سال بعد ہم اس صدی کے جاتے لمحوں کی آخری آہٹیں سن رہے ہوں گے۔ اس وقت آزادیوں اور انقلابات کی، عظیم جنگوں کی، ہٹلر کی، آئن اسٹائن کی، تسخیر قمر کی، سارتر اور رسل کی اور ہالی وڈ کی یہ صدی اپنا ورثہ ایک نئی صدی کے دامن میں ڈال کر خود تقویم پارینہ کا حصہ بن رہی ہوگی۔ دو صدیوں کے اس سنگم پر ہم اور آپ یا یوں کہہ لیں کہ ہمارا ملک کس حال میں ہوگا، کن مسائل کی آماجگاہ ہوگا۔ اکیسویں صدی کے ساتھ آنکھ کھولنے والی نسل اپنے آپ کو کس قسم کے حالات سے دوچار پائیگی۔ وہ بے یقینی اور تذبذب کے عذاب میں مبتلا ہوگی یا اعتماد کے ساتھ نئی صدی میں اپنا سفر شروع کر سکے گی؟

کسی زمانے میں مستقبل بینی جادوگروں کا کام ہوتا تھا۔ اس صدی تک پہنچتے پہنچتے یہ سائنس فکشن کا موضوع بن گیا۔ فکشن لکھنے والے افسانہ طرازی کرتے تھے کہ دس سال بعد بیس سال بعد یا پچاس سال بعد کیسی کیسی چیزیں ایجاد ہو جائیں گی۔ زندگی کتنی محیر العقول ہو جائے گی۔ پھر عالمی سیاست اور اقتصادیات کے موضوعات بھی مستقبل بین فکشن میں جگہ پانے لگے۔ جارج آرویل کی دلچسپ تصنیف "۱۹۸۴ء" اور پال ای اردمن کی "کریش آف ۷۹ء" آپ کے ذہن

میں ہوں گی مگر اب مستقبل کے بارے میں اندازے صرف فکشن کا موضوع نہیں رہے ہیں۔ آج کی دنیا میں گیارہ برس آگے دیکھنا نہ تو کوئی قابل ذکر فیوچرولوجی ہے اور نہ ہی کوئی غیر معمولی فکشن، سائنس اور اس کے قوانین اس درجہ ترقی کر چکے ہیں کہ ذرا سی تحقیق سے حقیقت منتظر، لباس مجاز میں نظر نواز ہو جاتی ہے۔ مستقبل اب شاعروں کے احاطہ خیال تک محدود نہیں رہا ہے۔ اب ماہرین معاشیات، تکنیکی ذہن اور منصوبہ ساز ادارے مستقبل کی قبل از وقت تصویر کشی کر لیتے ہیں۔ شاعری اور افسانے کی جگہ اعداد شمار نے، گنجلک جدولوں اور ٹیڑھے ترچھے گرافوں نے لے لی ہے۔ اس منشور میں سے دیکھیں تو صاف نظر آتا ہے کہ گیارہ سال بعد پاکستان کہاں ہوگا، کس حال میں ہوگا۔

اس صدی کے اختتام پر پاکستان کا سب سے بڑا مسئلہ اس کی آبادی ہوگی۔ ملک کی آبادی ماضی میں جس رفتار سے بڑھی ہے اور اس وقت اس کی جو شرح اضافہ ہے اس کے پیش نظر مستقبل کی صورت حال بہت مایوس کن اور پیچیدہ نظر آتی ہے۔ پاکستان جن علاقوں پر مشتمل ہے ان میں اس صدی کے آغاز پر مجموعی طور پر سولہ ملین یا ایک کروڑ ساٹھ لاکھ افراد آباد تھے۔ پچاس سال بعد ان کی تعداد دگنی ہو گئی اور ۱۹۷۰ء تک پہنچتے پہنچتے آبادی چونسٹھ ملین یا چھ کروڑ چالیس لاکھ ہو چکی تھی۔ پاکستان میں آبادی میں اضافے کا تناسب تین فیصد سالانہ ہے یعنی ہر بیس سال بعد ملک کی آبادی دگنی ہو جاتی ہے۔ اس لحاظ سے دیکھا جائے تو صدی کے اختتام پر ملک کی آبادی ۱۵۴ ملین یعنی پندرہ کروڑ چالیس لاکھ ہوگی۔ اس ہجوم آبادی میں اڑسٹھ ملین کی عمر پندرہ برس سے کم ہوگی۔

اس وقت ہمارے ملک میں آبادی کا شہروں کی طرف منتقل ہونا ایک اہم اور دور رس نتائج کا حامل رجحان ہے۔ گیارہ سال بعد یہ موجودہ رجحان کیا اثرات پیدا کر چکا ہوگا۔ یہ بہت اہم سوال ہے۔ صدی کے اختتام تک شہروں میں رہنے والوں کی تعداد اڑسٹھ ملین یعنی چھ کروڑ اسی لاکھ تک پہنچ چکی ہوگی۔ اس کا مطلب ہے کہ اس وقت پاکستان میں موجودہ کراچی جیسے چھ مزید شہروں کی ضرورت ہوگی۔

یہ چند اعداد و شمار اس بھیانک اور مسائل سے پر پاکستان کی جزوی تصویر پیش کرنے کے لیے کافی ہیں جسکے معرض وجود میں آنے میں محض دس گیارہ سال کا فاصلہ باقی رہ گیا ہے۔ ان مسائل کا تدارک اگر اسی وقت کے لیے چھوڑ دیا گیا تو شاید یہ بہت بعد از وقت ثابت ہوگا۔ اس سیلاب کے آگے بند باندھنے کے لیے ابھی سے سنجیدگی کے ساتھ غور کرنے کی ضرورت ہے۔ آبادی میں اضافے کا مسئلہ تیسری دنیا کے ممالک کا ایک عام مسئلہ ہے۔ ہر ملک میں اس کے اسباب اور اضافے کو روکنے یا کم تر کرنے کی راہ میں حائل دشواریوں کی نوعیت مختلف ہے۔

پاکستان کی حد تک یہ مسائل مخصوص، سماجی، تعلیمی، اور معاشرتی عوامل کی پیداوار ہیں۔

سماجی سطح پر آبادی میں اضافے کا اہم ترین سبب ملک کی اکثریت کی ناخواندگی ہے جس کی وجہ سے لوگ افزائش نسل کے مختلف پہلوؤں اور اس کے دور رس نتائج سے بے بہرہ ہوتے ہیں۔ پاکستان میں ناخواندہ گھرانوں میں لڑکیوں کے مقابلے میں لڑکوں کو فوقیت حاصل ہوتی ہے۔ بعض اوقات اس وقت تک بچے پیدا کیے جاتے ہیں جب تک اولاد نرینہ نہ پیدا ہو جائے۔ اولاد نرینہ کی خواہش، افزائش نسل کا ایک اہم سبب بنتی ہے۔ سوال یہ ہے کہ اولاد نرینہ پر لوگ اصرار کیوں کرتے ہیں۔ مختلف علاقوں اور خاندانوں میں اس کے اسباب مختلف ہیں۔ مثلاً بعض خاندانوں میں لڑکے کو بڑھاپے کا سہارا سمجھا جاتا ہے۔ بعض جگہ یہ خیال عام ہے کہ لڑکے سے خاندان اور نسل آگے بڑھتے ہیں۔ کچھ خاندانوں میں لڑکے کی خواہش یوں بھی کی جاتی ہے کہ ان کے خیال میں لڑکوں کی تعداد باپ کی مردانگی کا ثبوت ہوتی ہے۔ لڑکے کی ولادت خاندان کے ادارے کی بقا کے لیے بھی ضروری سمجھی جاتی ہے۔ ایک ہی چھت کے نیچے رہنے والے خاندان کے سب افراد ایک دوسرے کے دکھ درد بانٹتے ہیں۔ اس نظام کا ایک فائدہ یہ بھی ہے کہ اگر کسی بچے کے ماں باپ مر جائیں تو پرورش کرنے والے چچا، ماموں یا دوسرے رشتہ دار موجود ہوتے ہیں۔

لڑکے کی خواہش کے علاوہ افزائش آبادی کا ایک اہم سبب لڑکیوں کی کم عمری کی شادیاں ہیں۔ دیہات اور کم ترقی یافتہ علاقوں میں لڑکیوں کے سن بلوغ کو پہنچتے ہی ان کی شادی کر دی جاتی ہے۔ اس کی وجوہ بھی مختلف النوع ہیں۔ مثلاً ایک اہم سبب یہ ہے کہ لڑکیوں کے پاس انتخاب کی آزادی نہیں ہوتی۔ شادی کے علاوہ ان کے پاس زندگی میں اور کوئی ٹھوس مقصد نہیں ہوتا۔ پھر ناخواندگی اور ذہنی پسماندگی کی وجہ سے جوان لڑکی کا زیادہ مدت تک ماں باپ کے گھر میں بیٹھے رہنا معیوب سمجھا جاتا ہے اور ماں باپ اسے اپنے لیے باعث ندامت خیال کرتے ہیں۔

ان سماجی عوامل کے علاوہ شرح افزائش میں اضافے کے اور بھی کئی اسباب ہیں۔ ملک کے با اختیار افراد کے درمیان افزائش آبادی کی روک تھام کے حوالے سے اتفاق رائے کی عدم موجودگی بجائے خود ایک اہم مسئلہ ہے۔ کچھ سیاستدان، اور با اثر افراد بڑے اعتماد کے ساتھ یہ کہتے ہیں کہ آبادی کو گھٹانے یا کم کرنے کا مشورہ دراصل سامراجی حکمت عملی ہے جس کا مقصد مسلمانوں کی تعداد کم کرنا اور ان کی اجتماعی قوت کو کمزور کرنا ہے۔ مذہبی حلقوں میں خاندانی منصوبہ بندی عدم مقبولیت کا شکار رہی ہے۔ مذہبی علماء خاندانی منصوبہ بندی کو ناپسندیدہ اور غیر اسلامی قرار دے کر مسترد کر دیتے ہیں۔ ان علما کے طرز فکر کے زیر اثر بڑی تعداد میں لوگ اسی نہج پر سوچتے ہیں۔

آبادی میں بڑھتے ہوئے اس اضافے کے پیچھے کارفرما سماجی و معاشرتی عوامل سے قطع نظر خود اقتصادی منصوبہ بندی کے اداروں کی کوتاہیاں اور غلط فیصلے بھی اس کا سبب بنے ہیں۔ ملکی وسائل کو گرفت میں لانے میں یہ ادارے صرف اسی وجہ سے ناکام نہیں رہے کہ معاشرتی حالات سازگار نہیں تھے بلکہ ان اداروں کی اپنی کوششیں اور فیصلے بھی سقم سے خالی نہیں تھے۔

ہمارے یہاں ۱۹۵۰ء اور ۱۹۶۰ء کی دھائیوں میں منصوبہ بندی کی جملہ ذمہ داری ہارورڈ کے ماہرین کے سپرد کردی گئی تھی۔ ان دنوں منصوبہ بندی کمیشن میں امریکی ماہرین اور ٹیکنو کریٹس کی بھرمار تھی۔ ان ماہرین کی خدمات اس مفروضے کے پیش نظر مستعار لی گئی تھیں کہ سب سے زیادہ ترقی یافتہ ملک کے ماہرین ہمارے نوآزاد ملک کو بھی ترقی کی راہ پر لگادیں گے۔ ان ماہرین نے پاکستان کے لیے جو منصوبے تجویز کیے وہ ملکی معاشرتی و سماجی حالات سے زیادہ مطابقت نہیں رکھتے تھے۔ ان منصوبوں کی تیاری کے وقت ایک آزاد اور خود مختار ملک کی اقتصادی ضروریات کو بھی خاطر خواہ توجہ اور اہمیت نہیں دی گئی تھی۔ نتیجتاً اقتصادی ترقی کے جو ماڈل پاکستان کو فراہم کیے گئے ان پر ابتدائی عملدرآمد ہی کے نتیجے میں ارتکاز دولت کا رجحان سامنے آگیا۔ ارتکاز سرمایہ کے اس قوی تر رجحان کو ۱۹۶۰ء کی دھائی میں سرکاری فلسفے کی حیثیت حاصل رہی۔ اس حکمت عملی کا جواز یہ پیش کیا گیا کہ ہمارے پاس جس قدر زیادہ سرمایہ ہو گا اسی قدر ہم مزید سرمایہ کاری کے اہل ہوں گے۔ اس رجحان کے زیر اثر بظاہر ملک میں صنعتی ترقی اور ترقیاتی پھیلاؤ کی صورت پیدا ہوئی مگر سماجی سطح پر اس کے فوائد ایک بہت ہی قلیل گروہ تک محدود رہے۔ عام آدمی ملک کی پیداواری سرگرمی سے کوئی منفعت حاصل نہیں کرسکا۔

ایوب خان کے دس سالہ دور میں متمول اور سرمایہ دار طبقے کے لیے تعیشات زندگی کو ایک عام آدمی کے لیے ضروری وسائل زندگی کے اوپر جو فوقیت حاصل رہی اس کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے کہ ۱۹۵۸ء سے ۱۹۶۸ء کے درمیان تین سو ملین امریکی ڈالر صرف کاروں کی درآمد پر خرچ کیے گئے جبکہ اسی مدت میں بسوں کی درآمد پر خرچ کی جانے والی رقم کی تعداد صرف بیس ملین ڈالر تھی۔

۱۹۷۰ء کی دہائی میں بہت سی اقتصادی اصلاحات کا اعلان کیا گیا۔ مگر ان اصلاحات پر عملدرآمد کے لیے ایک مرتبہ پھر بیوروکریسی ہی پر انحصار کرنا پڑا۔ بیوروکریسی اس فرض کی انجام دہی میں کامیاب نہیں ہوسکی۔ پھر افراطِ زر اور بعض دیگر بین الاقوامی اقتصادی رجحانات نے ملکی معیشت پر منفی اثرات مرتب کیے۔

اس پس منظر میں ملک کے موجودہ مسائل کا جائزہ لینے سے جو تصویر ابھر کر سامنے آتی ہے اسے نرم ترین الفاظ میں مایوس کن کہا جاسکتا ہے۔ ان مسائل کی شرح اضافہ کو گیارہ سال بعد تک

پھیلا کر دیکھیں تو اگلی صدی اس وقت سے بھی زیادہ مشکلات میں گھری نظر آتی ہے۔

پاکستانی معیشت میں اس وقت ایک اہم قوت وہ تارکین وطن ہیں جو بیرونی ممالک میں ملازمت کی غرض سے مقیم ہیں۔ پاکستان کے موجودہ تجارتی خسارے اور دیگر اقتصادی کمزوریوں کا ازالہ بیرون ملک پاکستانیوں کے بھیجے ہوئے زرمبادلہ سے ہوتا ہے۔ مگر آمدنی کا یہ ذریعہ زیادہ دیرپا ثابت نہیں ہوگا۔ تیل پیدا کرنے والے عرب ممالک جہاں پاکستانی تارکین وطن کی اکثریت آباد ہے، بنیادی طور پر عمارات، پلوں اور دوسرے ڈھانچوں (INFRASTRUCTURE) کی تعمیر ہی پر سرمایہ کاری کر رہے ہیں۔ جوں جوں یہ تعمیرات مکمل ہوتی جائیں گی ویسے ویسے پاکستانی ہنر مندوں کی ضرورت بھی ختم ہوتی جائے گی۔ مشرق وسطیٰ کی جانب تارکین وطن کا جو سیلاب چلا تھا اس میں اب واضح کمی ہوتی چلی جا رہی ہے۔ ۲۰۰۱ء تک باہر کے دروازے بند ہو چکے ہوں گے۔ اب تک تو یہ ایک سیفٹی والو کا کردار ادا کر رہا ہے اور ہماری معیشت کو سہارا دیئے ہوئے ہے مگر یہ سلسلہ زیادہ عرصے نہیں چل سکے گا۔

ہمارے ہاں محنت کشوں کی تعداد میں ہر سال ۲ء۳ فیصد اضافہ ہو جاتا ہے۔ ہماری معیشت ان افراد کو روزگار مہیا کرنے سے قاصر ہے۔ نتیجتاً ہنر مند اور نیم ہنر مند افراد قانونی یا غیر قانونی ذرائع سے باہر نکلنے کی کوششیں کرتے ہیں۔ اس وقت تقریباً ۵ء۱ بملین افراد باہر ملازمت کر رہے ہیں مگر ایک تو تعمیرات کی گرم بازاری BOOM اپنے اختتام کی طرف مائل ہے۔ اس کے علاوہ ان ملکوں میں پس روی RECESSION کا رجحان زور پکڑ رہا ہے۔ گذشتہ چند برسوں میں تیل کی معیشت بھی غیر یقینی کا شکار رہی ہے۔ یہ سب آثار اس جانب اشارہ کر رہے ہیں کہ مسائل کا ایک زیادہ گمبھیر دور ہماری طرف بڑھ رہا ہے۔ ہمیں ابھی سے اس جانب توجہ دینی ہوگی کہ جب لاکھوں پاکستانی مزدور، ہنرمند، انجینئر، کنسٹرکٹر، تکنیکی استعداد رکھنے والے افراد واپس عازم وطن ہوں گے تو یہاں کس قسم کے مسائل پیدا ہوں گے۔ اتنی بڑی تعداد میں لوگوں کے لیے روزگار فراہم کرنا بے حد مشکل ہوگا نہ صرف روزگار بلکہ بیرون وطن سے لوٹنے والے پاکستانیوں کو عمدہ معیار کی نوکریاں درکار ہوں گی کیونکہ عرب ملکوں میں ملازمت کے نتیجے میں ان کا معیار زندگی بلند ہو چکا ہے۔ وہ فطرتاً اپنے اس معیار کو برقرار رکھنے کے خواہش مند ہوں گے۔ ۲۰۰۱ء میں ہمیں اپنی لیبر فورس کے لیے تین کروڑ نئی ملازمتوں کی ضرورت ہوگی۔

تارکین وطن کے مسئلے سے ہٹ کر بھی بے روزگاری ایک اہم مسئلہ ہے۔ ہمارے ملک کی موجودہ ترقیاتی صورت حال ایک محدود تعداد سے زیادہ افراد کو ملازمتوں میں کھپانے کی صلاحیت نہیں رکھتی۔ جوں جوں آبادی میں اضافہ ہو رہا ہے ویسے ویسے بیروزگاری کی شرح بھی بڑھ رہی ہے۔ پاکستان کا شمار دنیا کے ان ممالک میں ہوتا ہے جہاں بیروزگاری کی شرح سب سے زیادہ ہے۔

ملک میں روزگار کی صورت حال کا ایک فکر انگیز پہلو یہ ہے کہ یہاں محنت کرنے والے بچے کل محنت کش طبقے کا ایک تہائی ہیں۔ محنت کشوں میں عورتوں کا تناسب پانچ فیصد کے قریب ہے مگر بڑی تعداد میں عورتیں اپنے گھروں میں، کھیتوں میں یا تعمیراتی کاموں میں بھی سرگرم ہیں۔ ان کو ان پانچ فیصد محنت کش عورتوں میں شامل نہیں کیا گیا ہے جو باضابطہ طور پر ملازمت کرتی ہیں۔

ملک میں غربت کا اندازہ محنت کش بچوں کے اعداد و شمار سے بھی لگایا جا سکتا ہے۔ شہروں میں یہ بچے ورکشاپوں، دکانوں اور ہوٹلوں میں کام کرتے ہیں، بسوں، لاریوں اور ویگنوں میں انتہائی کم اجرتوں پر مشکل اور تھکا دینے والے کام کرتے ہیں۔ شہروں ہی میں معصوم بچوں کے ننھے منے کاندھے بھاری، بھرکم اینٹیں ڈھوتے ہیں۔ شہروں سے دور دیہات میں بچے بیج بونے اور فصل کاٹنے میں مدد دیتے ہیں۔ اس کے علاوہ ملک کے کئی علاقوں میں بیگار کیمپ قائم ہیں جہاں اغوا شدہ بچے اور نابالغ بچے جبری محنت پر مجبور ہوتے ہیں۔ بیگار کیمپوں کے یہ محصور بچے بچپن کی سرحدوں کو عبور کرنے کے بعد جوانی کی دہلیز پر قدم رکھتے ہیں تب بھی وہ اسی بیگار کیمپ کا حصہ ہوتے ہیں۔ ان کیمپوں میں ایسے مجبور اور بے بس لوگ بھی کام کرتے ہیں جو قرض نہ اتار سکنے کی سزا کے طور پر یہ عذاب سہہ رہے ہوتے ہیں۔

روزگار کا تعلیم سے گہرا تعلق ہے۔ ملک کی بڑھتی ہوئی آبادی نے تعلیم کے لیے کی گئی اب تک تمام سرکاری کوششوں کو ناکام بنا دیا ہے۔ اس کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے کہ ۴۹۔۱۹۴۸ء میں تعلیم پر چھتیس ملین روپے خرچ ہوئے۔ ۱۹۶۱ء تک بڑھ کر یہ ۵۳۱ ملین روپے ہو گئے۔ تعلیم پر خرچے میں اضافے کے باوجود اسی عرصے میں پانچ سال سے اوپر کی عمر کے افراد میں ناخواندگی کا تناسب ۸۲ فیصد سے بڑھ کر ۸۴ فیصد ہو گیا۔ گویا آبادی میں تیز رفتار اضافے نے خواندگی کے تناسب کو بہتر نہیں ہونے دیا۔

اس وقت پاکستان کے وسائل کا صرف دو فیصد تعلیم پر خرچ ہو رہا ہے جبکہ پاکستان ہی جتنی جی این پی (GNP) رکھنے والے دوسرے ملکوں میں تعلیم پر خرچ ہونے والی رقم کا تناسب تین فیصد ہے۔ ہمارے یہاں تعلیمی صورت حال یہ ہے کہ اگر سو طلبہ پہلے گریڈ میں داخل ہوتے ہیں تو صرف چھپن پانچویں گریڈ تک پہنچتے ہیں اور دسویں گریڈ تک پہنچتے پہنچتے صرف ۲۰ طلبہ باقی رہ جاتے ہیں۔ اس رجحان کے کئی اسباب ہیں۔ سب سے پہلی وجہ تو یہ ہے کہ کسانوں کے بچے دو ایک سال اسکول میں گزارنے کے بعد باپ کا ہاتھ بٹانے کے لیے مجبوراً کھیتوں میں جانے لگتے ہیں۔ پھر بچوں کو جو تعلیم اسکولوں میں دی جاتی ہے۔ وہ ان کے ماحولیاتی تقاضوں سے بہت کم مطابقت رکھتی ہے۔

اعلیٰ تعلیم کی صورت حال بھی کوئی حوصلہ افزا نہیں۔ یونیورسٹیوں سے فارغ التحصیل گریجویٹ اور دیگر اعلیٰ تعلیم یافتہ لوگ معاشرے میں اپنا مصرف نہیں پاتے۔ جس رفتار سے تعلیم یافتہ نوجوان نکل رہے ہیں۔ ہماری معیشت اس رفتار سے آگے نہیں بڑھ رہی۔ ایک گریجویٹ پر اندازاً پچاس ہزار روپیہ صرف ہوتا ہے جو ٹیکس دہندگان کی جیب سے جاتا ہے۔ اس خطیر سرمائے کے اصراف کے باوجود تعلیم یافتہ افراد اگر مناسب ملازمتوں میں جگہ نہ پاسکیں اور قومی ترقیاتی عمل میں حصہ نہ لے سکیں تو یہ قومی سرمائے کے زیاں ہی کی صورت ہے۔ اگلے دس گیارہ برسوں میں تارکین وطن، بیروزگاری اور ناخواندگی کے مسائل کے علاوہ ایک بہت بڑا مسئلہ قرضوں کا بوجھ ہوگا جس میں آئے دن اضافہ ہوتا جارہا ہے۔ پاکستان کی حکومتیں ماضی میں بھی ملکی معیشت کو چلانے کے لیے بیرونی قرضوں پر انحصار کرتی رہی ہیں اور اب پاکستان پرانے قرضوں کو چکانے کے لیے نئے قرضے حاصل کر رہا ہے۔ ۲۰۰۱ء میں پاکستان ایک سو آٹھ بلین ڈالر کا مقروض ہوگا اور چودہ بلین ڈالر سالانہ کی رفتار سے قرضے ادا کر رہا ہوگا۔ قرضوں پر استوار معیشت کے لیے مزید دہلا دینے والی حقیقت یہ ہے کہ قرض دینے والے ممالک اب مزید قرضے دینے میں فراخدلی کا مظاہرہ کرتے نظر نہیں آرہے۔ گو بین الاقوامی بنکاری نظام اپنی ضروریات کے پیش نظر اور اپنی حکمت عملی کے تحت امداد دینے کی پالیسی پر قائم ہیں تاہم بعض عالمی مسائل امداد کی ترسیل کے عمل میں مزاحم ہیں۔ جو ملک پاکستان کو امداد دیتے ہیں ان کی معیشتیں STAGNATION کا شکار ہیں۔ افراط زر ان کے لیے مستقل مسئلہ بنا ہوا ہے۔ تیل کی قیمتیں بھی ان پر اثر انداز ہو رہی ہیں۔ ان تمام مسائل کے زیر اثر متعلقہ ممالک پاکستان کو امداد جاری رکھنے میں مشکلات محسوس کریں گے۔

عین اسی وقت تجارت کی شرائط بھی پاکستان کے حق میں نہیں ہوں گی۔ پاکستان کی برآمدات کی مالیت اور قدر، اس کی درآمدات کی قدر سے بہت کم ہوگی۔ یہ تمام چیزیں پاکستان کے توازن ادائیگی پر ناقابل برداشت بوجھ ڈال دیں گی۔ اس کا ایک حل یہ ہوسکتا ہے کہ درآمدات کو ابھی سے کم کر کے برآمدات میں اضافے کی کوششیں کی جائیں۔ اس وقت پاکستان کی درآمدات کا ۵۴ فیصد حصہ اشیائے استعمال پرزوں یا اشیائے استعمال کی صنعتوں کے خام مال پر مشتمل ہوتا ہے۔ یہ تمام اشیاء ملکی معیشت اور ترقیاتی عمل میں کوئی کردار ادا نہیں کرتیں۔ اصولاً درآمدات کا زیادہ تر حصہ پٹرول، خوردنی تیل اور کھاد جیسی اشیاء پر مشتمل ہونا چاہیے۔
اس وقت ہمارے ملک میں اشیائے صرف کی درآمد کا جو رجحان اور رفتار ہے اس کے مطابق ۲۰۰۱ء میں درآمدات کی مالیت ۵۰ سے ۸۰ ہزار ملین ڈالر کے درمیان ہوگی۔ اس صورت حال سے عہدہ برآ ہونے کا سب سے قابل فہم طریقہ یہی ہے کہ ملکی برآمدات کو فروغ دیا جائے۔ مگر

یہاں بھی مشکلات کچھ کم نہیں ہوں گی۔ اس وقت عالمی منڈیوں میں بہت سخت مقابلہ ہے۔ تیسری دنیا کے دوسرے ملک بھی اپنی اپنی مصنوعات کے ساتھ انہی منڈیوں کی طرف جا رہے ہیں۔ مستقبل میں یہ مقابلہ آرائی مزید تیز ہو جائے گی۔

ملک کے ان تمام متوقع مسائل کو جو حقیقت مزید بھیانک شکل دیتی ہے وہ یہ ہے کہ پاکستان میں صنعتی شعبہ گذشتہ کئی برسوں سے غیر فعال ہے۔ ۱۹۶۰ء کی دہائی میں صنعتی شعبے میں جو پھیلاؤ آیا تھا وہ ۱۹۷۰ء کے عشرے میں سمٹ کر محدود ہو گیا۔ صنعتی سرگرمیوں کے سکڑنے کے ساتھ ساتھ عمارتی تعمیرات کا سلسلہ شروع ہوا جو ظاہر ہے صنعت کا نعم البدل نہیں تھا بلکہ بجائے خود ایک منفی رجحان تھا کیونکہ کنسٹرکشن بوم پر جو سرمایہ کاری ہو رہی تھی وہ صنعتی شعبے میں کہیں زیادہ سود مند اور دور رس نتائج کی حامل ثابت ہو سکتی تھی۔ گذشتہ کئی برسوں میں صنعتی شعبہ اپنے جمود زدہ ماحول سے باہر نہیں نکل سکا ہے۔ اور مستقبل قریب میں بھی اس کی بحالی کے کوئی واضح امکانات نظر نہیں آ رہے ہیں۔

صنعتی جمود کے اس ماحول میں زراعت ہی ملکی معیشت کی بنیاد ہے۔ ہماری معیشت ماضی میں بھی بنیادی طور پر زرعی معیشت تھی اور آج بھی یہ زرعی معیشت ہے۔ بیچ کے برسوں میں جو صنعتی سرگرمی شروع ہوئی تھی۔ وہ بس ایک منزل ہی تک جا سکی۔ مگر آئندہ چند برسوں میں جو صورت حال سامنے آنے والی ہے اس کا ایک اہم پہلو یہ ہے کہ ہماری زراعت بھی ہماری بڑھتی ہوئی آبادی کا ساتھ نہیں دے سکے گی۔ ۲۰۰۱ء میں ۱۵۴ ملین افراد کا پیٹ بھرنا انتہائی مشکل کام ہو گا۔ موجودہ زرعی وسائل اتنی بڑی تعداد کا پیٹ بھرنے سے قاصر ہوں گے۔ اگر ۲۰۰۱ء میں آبادی ۱۵۴ ملین تک پہنچ جاتی ہے۔ تو اس کا مطلب یہ ہو گا کہ ہمیں گندم کی پیداوار کو جو اس وقت ۸٫۷ ملین ٹن ہے بڑھا کر ۱۸٫۲ ملین ٹن کرنا ہو گا۔ بناسپتی گھی کی پیداوار کو ۳۳۲,۰۰۰ ٹن سے ۹۱۹,۰۰۰ ٹن تک اور گوشت کو ۶۵۵,۰۰۰ سے بڑھا کر ۱٫۴۵ ملین ٹن تک پہنچانا ہو گا۔

پاکستان نے اپنے ابتدائی پچیس برسوں میں زرعی پیداوار میں اضافہ کیا تھا۔ اچھے بیجوں، کیمیائی کھاد کے استعمال اور بعض دیگر اقدامات کے نتیجے میں زرعی پیداوار میں اضافہ ہوتا رہا تھا۔ البتہ گزشتہ چند برسوں میں زرعی پیداوار کی صورت حال بہتر نہیں رہی زرعی پیداوار میں کمی کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ ۱۹۶۰ء سے ۱۹۶۹ء تک کے عرصے میں گندم، کپاس اور چاول کی پیداوار علی الترتیب ۷۳ فیصد، ۷۵ فیصد اور ۹۷ فیصد بڑھ گئی تھیں مگر ۱۹۷۰ء اور ۱۹۷۹ء کے درمیان گندم اور چاول کے لئے پیداوار میں اضافے کی شرح گر کر ۳۶ فیصد تک آ گئی۔ جب کہ کپاس کے لیے پیداوار کی شرح ۱۹۷۰ء کے عشرے کے ابتدائی برسوں میں بڑھ کر پھر اسی پرانے

فیصد پر آ گئی۔

بڑھتی ہوئی آبادی اور کمتر پیداواری صلاحیت کے نتیجے میں عام لوگوں کی غذا پر برا اثر پڑا ہے۔ آج ایک اوسط پاکستانی کی غذا بہت کم ہے اوسطاً ہر پاکستانی دن میں تین سو گرام گندم کھاتا ہے ۲۰ گرام دال، ۱۱٫۵ گرام گھی، ۲۵ گرام گوشت اور ۸۰ گرام سبزیاں اس کی روزانہ غذا میں شامل ہیں مگر یہ اعداد و شمار اوسط غذا کے ہیں۔ عملاً ہر پاکستانی روزانہ اتنا نہیں کھاتا۔ پیداواری تقسیم اور غریب اور امیر کے فرق کے نتیجے میں کچھ لوگ اس سے کہیں زیادہ اور کچھ ان اعداد شمار سے کہیں کم غذا حاصل کرتے ہیں۔ کچھ لوگ خوش خوراک ہیں۔ اچھا کھاتے ہیں اور غذا کو محفوظ بھی کر لیتے ہیں۔ دوسری طرف ایسے افراد ہیں جنہیں بمشکل اتنا مل پاتا ہے کہ وہ اپنا سلسلہ نفس جاری رکھ سکیں۔

غذا کی طلب بڑھ رہی ہے مگر فی کس زیر کاشت زمین کمتر ہوتی جا رہی ہے۔ ۱۹۵۱ء میں فی کس زیر کاشت زمین ۰٫۴۵ ہیکٹر تھی۔ ۱۹۷۷ء میں گر کر یہ ۰٫۲۶ ہیکٹر رہ گئی۔ اگر فی کس زیر کاشت زمین کی شرح اسی رفتار سے گرتی رہی تو ۲۰۰۱ء میں یہ محض ۰٫۱۵ ہیکٹر رہ جائے گی۔ دوسرے لفظوں میں موجودہ غذائی ضروریات کی شرح کو اگر اسی جگہ پر برقرار رکھا جائے تب بھی ۲۰۰۱ء تک موجودہ فی ایکڑ پیداوار کو دگنا کرنا پڑے گا۔

پاکستانی زراعت کو آئندہ چند برسوں میں بعض خطرناک مسائل کا سامنا ہوگا۔ سیم و تھور ماضی میں بھی ایک مسئلہ رہا ہے۔ آئندہ برسوں میں بھی یہ ایک بڑا خطرہ بنا رہے گا۔ پاکستان ہر دس منٹ میں دو ایکڑ زمین سے ہاتھ دھو بیٹھتا ہے۔ یہ رفتار جاری رہی تو آئندہ دس گیارہ برسوں میں جو حالت درپیش ہوگی اس کا اندازہ لگانا چنداں مشکل نہیں۔

سیم و تھور کے علاوہ ہماری زرعی فصلوں کو کیڑے مکوڑوں کی آفات کا بھی سامنا کرنا پڑتا ہے گو فصلوں کو تلف ہونے سے بچانے کے لیے مختلف اقسام کی ادویات اور کیمیائی اشیاء ایجاد ہو چکی ہیں مگر اقوام متحدہ کے ماحولیاتی پروگرام کی تحقیق کے مطابق کیڑوں کی ۳۶۴ اقسام ایسی ہیں جن پر ان ادویات کا کوئی اثر نہیں ہوتا۔ دو اہم فصلیں جن پر ان کے حملے کا خطرہ بہت زیادہ ہے کپاس اور چاول ہیں اور دونوں فصلیں پاکستان کے لیے بہت اہم ہیں۔ ایک اندازے کے مطابق دنیا کی اناج کی پیداوار کا ۲۵ فیصد حصہ اسی وجہ سے تلف ہو جاتا ہے کہ اس کی ذخیرہ اندوزی کا مناسب انتظام نہیں کیا جاتا۔

آبادی میں ہونے والا غیر معمولی اضافہ صرف اسی لیے پریشان کن نہیں ہے کہ ملکی پیداوار اس رفتار سے مطابقت نہیں رکھتی بلکہ اس بڑی آبادی کی رہائش بھی، انتہائی مشکل مسئلہ ثابت ہوگی۔ جوں جوں دیہات کی آبادی بڑھتی جا رہی ہے۔ ویسے ویسے دیہات کو وسعت

حاصل نہیں ہو رہی۔ ۔۔ پہلے کے مقابلے میں گنجان آباد ہوتے جا رہے ہیں۔ مسئلہ یہ ہے کہ اگر دیہات کو پھیلایا جاتا ہے تو کاشت شدہ فی ایکڑ زمین کم ہو جائے گی۔ کثیر الآبادی دیہات دوسری طرح کے مسائل کو جنم دیں گے۔ دیہات کی نکاسی کا موجودہ نظام کم آبادیوں کے حساب سے بنایا گیا تھا۔ آبادیوں کے بڑا ہو جانے پر یہ نظام ناکارہ ہو جائے گا۔ اور صحت کے مسائل کو جنم دے گا۔

دیہات میں وسائل زندگی کی فراہمی کا دباؤ بڑھتا جا رہا ہے۔ جو لوگ دیہات سے نکل کر شہروں کو جاتے ہیں یا بیرون ملک سفر کرتے ہیں۔ وہ واپسی پر یا پھر اپنے خطوط کے ذریعے اپنے دیہات والوں کو یہ باور کراتے ہیں کہ دیہات سے باہر بڑی اچھی زندگی ہے۔ وہ جن کچے گھروں میں پیدا ہوتے ہیں۔ وہ انہیں کمتر نظر آنے لگتے ہیں۔ پیسہ آنے سے نمود و نمائش کی خواہش پیدا ہوتی ہے۔ ان دیہاتی باشندوں میں یہ فطری خواہش پیدا ہوتی ہے کہ وہ اپنے کچے مکانوں کو پکا کر لیں۔ وہ سیمنٹ کے مکان اور شیشے کی کھڑکیاں بنانے لگتے ہیں۔ گاؤں میں بجلی ہو نہ ہو ان کے گھروں میں بجلی کا سامان ضرور ہوتا ہے۔ خلیج کے ملکوں سے ۔۔ ٹیلی ویژن، ٹیپ ریکارڈر لے آتے ہیں۔ جوں جوں بجلی کی چھوٹی چھوٹی تفریحی اشیا دیہاتوں میں پہنچتی رہیں گی۔ ویسے ویسے بجلی کا مطالبہ بڑھتا چلا جائے گا۔ مگر ۴۲ سال بعد بھی پاکستان اپنے ۴۵ ہزار دیہات میں سے صرف ۱۸ فیصد میں بجلی کی روشنی پہنچا سکا ہے۔ سوچا جا سکتا ہے کہ بقیہ ۸۲ فیصد دیہات میں روشنی کے پہنچنے میں کتنا عرصہ درکار ہو گا یہی نہیں بلکہ جوں جوں وقت گزر رہا ہے۔ بجلی کا مطالبہ ماضی کے مقابلے میں زیادہ زور پکڑتا جا رہا ہے۔

بجلی ہی نہیں، دیہاتی علاقوں میں پینے کا پانی پہنچانے کی بھی اشد ضرورت ہے۔ سڑکوں سکولوں اور اسپتالوں کی مانگ بھی بڑھ چکی ہے۔

شہری زندگی کے مسائل، دیہی زندگی کے مسائل سے کم نہیں، زیادہ ہی ہوں گے۔ ہمارے یہاں شہروں کی حد تک آبادی میں ۵ء۵ فیصد کی رفتار سے اضافہ ہو رہا ہے۔ ۲۱ سال بعد شہروں کی آبادی موجودہ تعداد سے بڑھ کر تین گنا ہو چکی ہو گی۔ جب شہروں کی آبادی ساٹھ ملین ہو گی۔ اس وقت مکانات کا مسئلہ کیا شکل اختیار کر جائے گا۔ ملک میں غیر قانونی تجاوزات بہت عام ہیں۔ لاہور میں ۳۰ فیصد مکانات غیر قانونی طور پر قبضہ شدہ زمینوں پر تعمیر کیے گئے ہیں۔ گزشتہ چھ سال میں لاہور میں جتنے پلاٹ تعمیر کے لیے فراہم ہوئے ہیں۔ ۔۔ صرف ایک سال کی ضرورت اور مانگ کو پورا کرتے ہیں۔ دوسرے شہروں کی رہائشی صورت حال بھی اس سے بہتر نہیں ہے۔ زمین کی طلب میں اضافہ ان تارکین وطن کی وجہ سے بھی ہوا ہے جو زمینوں پر پیسہ خرچ کر رہے ہیں اور اسے سرمایہ کاری کی سب سے مفید جگہ سمجھتے ہیں۔ تارکین وطن کے اس رجحان نے زمینوں کی قیمتوں کو بہت بڑھا دیا ہے اور اب ایک عام پاکستانی جو نچلے متوسط یا غریب

طبقے سے تعلق رکھتا ہے اور پاکستان ہی میں مقیم ہے۔ اپنے اندر زمین خریدنے کی سکت نہیں رکھتا۔ زمینوں کی بڑھتی ہوئی قیمتوں کے علاوہ سیمنٹ، گلاس، سٹیل اور دوسرے تعمیراتی سامان کی گرانی نے بھی غریب آدمی کی کمر توڑ دی ہے اور اس کے لیے مکان کی ملکیت کو ایک خواب بنا دیا ہے۔ گیارہ سال بعد یہ خواب مزید بھیانک اور ڈراؤنا ہو جائے گا۔

بڑھتی ہوئی آبادی کے حوالے سے ٹریفک کا موجودہ نظام بھی ناکافی ثابت ہوگا۔ ہماری موجودہ سڑکیں اور ریل کی پٹڑیاں گیارہ سال بعد کی ضروریات کو پورا نہیں کر سکیں گی۔ اس وقت ریل کی ۸۸۱۵ کلومیٹر پٹریوں میں صرف ۸۲۵ کلومیٹر پٹڑیوں پر ڈبل ٹریک ہے۔ مستقبل میں ہمیں بڑی تعداد میں ڈبل ٹریک ڈالنے کی ضرورت ہوگی۔ پھر دریائے سندھ کے دائیں کنارے پر مجوزہ سڑک کی تعمیر سے بھی ٹریفک کا دباؤ کم ہو سکتا ہے۔

ایک اور شعبہ جس میں گیارہ سال بعد ہمیں شدید مشکلات کا سامنا ہوگا۔ وہ توانائی کا شعبہ ہے۔ پاکستان اس وقت توانائی پر ۹۰۰۰ ملین روپیہ خرچ کر رہا ہے۔ اندرون ملک توانائی کی مانگ میں اضافہ ہو رہا ہے اور دوسری طرف اوپیک کی طرف سے تیل کی قیمتوں میں بھی مسلسل اضافہ ہو رہا ہے۔ تیل کی ان بڑھتی ہوئی قیمتوں کے پیش نظر ضروری ہے کہ اس کے استعمال میں کمی کی جائے اور اس کے متبادل تلاش کیے جائیں۔ میلان اور ٹوکیو میں ٹیکسیوں میں اب پٹرولیم گیس استعمال ہو رہی ہے۔ اس تجربے سے پاکستان میں بھی فائدہ اٹھایا جا سکتا ہے۔ اس کے علاوہ سورج کی توانائی اور ہوا سے حاصل کردہ توانائی بھی زیر استعمال لائی جا سکتی ہے۔ مگر اس کے لیے ایک عظیم ٹیکنالوجیکل انقلاب کی ضرورت ہوگی۔ اس وقت پاکستان میں کراچی کے مقام پر نیوکلئیر پاور اسٹیشن موجود ہے۔ مستقبل میں ہمیں ایسے مزید پاور اسٹیشنوں کی ضرورت ہوگی۔

آنے والے سال، صحت کے حوالے سے بھی کوئی خوش کن تصویر پیش نہیں کرتے۔ علاج معالجے کی سہولتیں اس وقت بھی بہت ناقص ہیں گیارہ سال بعد بھی ان کی کوئی قابل اطمینان صورت نظر نہیں آ رہی۔

پاکستان میں میڈیکل سروسز دنیا میں ناقص ترین ہیں۔ ملک میں اس وقت ۸۷ ملین آبادی کے لیے صرف ۱۳۰۰۰ ڈاکٹرز، ۴۳۰۰ نرسیں ہیں۔ یہ حقیقت اپنی جگہ بڑی افسوسناک ہے کہ اس وقت ۹۰۰۰ ڈاکٹر جن کی تربیت پر ٹیکس دہندگان کے ۱۰۸۰ ملین روپے خرچ ہوئے ہیں۔ ملک سے باہر ہیں۔ آئندہ گیارہ سالوں میں ہمیں مزید ڈاکٹروں، نرسوں ہسپتالوں اور طبی سہولیات کی ضرورت ہوگی۔

مستقبل میں ہمیں جن مسائل کا سامنا کرنا ہوگا۔ ان کی یہ سرسری سی جھلک ہی رونگٹے کھڑے کر دینے کے لیے کافی ہے۔ ان مسائل کا احساس کر لینے کے لیے ہمارے پاس شاید زیادہ وقت

بھی نہیں ہے یہ وقت ہے کہ ہم آنے والے ان خطرات سے عہدہ براہونے کے لئے اقدامات کریں۔ ملکی مسائل اس قدر گھمبیر ہیں کہ ان پر پوری قوم کو، اخبارات ورسائل کو، سیاستدانوں اور دوسرے بااثر افراد کو مل کر غور کرنا چاہیے۔ یہ بات انتہائی حوصلہ شکن ہے کہ ہمارے ذرائع ابلاغ اس جانب متوجہ نہیں ہیں۔ ہمارے سیاستدان بھی بدقسمتی سے اقتصادی امور کو خاطر خواہ اہمیت نہیں دیتے۔ ملک کی کتنی سیاسی جماعتیں ہیں جنہوں نے ان امور پر غور کیا ہے، کوئی اقتصادی ریسرچ کروائی ہے یا قوم کے سامنے اقتصادی منشور پیش کیا ہے۔ ملک کی اقتصادیات کا کلیتاً بیوروکریسی پر انحصار مرکزیت کے رجحان کو تقویت پہنچاتا ہے۔ جو معاشی منصوبہ بندی کے حوالے سے نقصان دہ ثابت ہوتا ہے۔

گیارہ سال بعد جب نئی صدی کا آغاز ہو رہا ہوگا۔
جب پاکستان اپنی زندگی کی نصف صدی مکمل کر چکا ہوگا۔
جب پندرہ کروڑ سے زیادہ نفوس اس ملک میں رینگ رہے ہوں گے۔
جب ہمارے مسائل زیادہ اور وسائل کم ہوں گے۔
جب زمین فصلوں سے زیادہ انسانوں کو اگل رہی ہوگی۔
اس وقت کے بھیانک چہرے کو ہمیں آج ہی دیکھ لینا چاہیے۔ ہمارے پاس محض تھوڑی سی مہلت ہے۔ اسی میں ہم اس آنے والے طوفان کو ٹالنے یا اس کا رخ موڑنے کی تدبیریں کر سکتے ہیں اس کے بعد وقت ہمیں مہلت نہیں دے گا ..... اکیسویں صدی کے لیے ہمیں ابھی سے فیصلہ کرنا ہوگا۔ ابھی یا پھر کبھی نہیں۔

(سید جعفر احمد پاکستان اسٹڈی سنٹر جامعہ کراچی میں سیاسیات کے لیکچرار ہیں)۔

تبصرۂ کتب

تقسیم ہند اور قیام پاکستان کی نئی اور فکر انگیز تعبیر

تصنیف:
The Sole Spokesman: Jinnah, the Muslim League and the Demand for Pakistan.
مصنفہ: عائشہ جلال
پبلشر: کیمبرج یونی ورسٹی پریس۔
قیمت: ۵۰ء۲۷ پونڈ

ڈاکٹر عائشہ جلال کی زیر تبصرہ کتاب کیمبرج کے مدرسہ فکر کی ایک نمائندہ تصنیف ہے جو بورژوا راویت کے دائرے میں رہتے ہوئے لکھی گئی ہے جس کی رو سے تاریخ کا بناؤ اور بگاڑ افراد کا مرہون منت ہوتا ہے، عظیم افراد کروڑوں انسانوں کے مستقبل کا فیصلہ کرتے ہیں اور نئے ممالک اور اقوام کو عالم وجود میں لاتے ہیں۔ محمد علی جناح بھی عائشہ جلال کی نگاہوں میں ایسے ہی بڑے آدمی ہیں جو ہوشیار، محتاط، باریک بیں اور سب سے بڑھ کر یہ کہ غیر معمولی صبر کے حامل ہیں اور اپنے انہی اوصاف کی بدولت وہ مسلمانوں کے حقوق کے لیے چار عشروں تک مصروف جدوجہد رہنے کے بعد بالآخر ایک علیحدہ مملکت کے حصول میں کامیاب ہو جاتے ہیں۔

عائشہ جلال کی اس تحقیقی کتاب پر کسی پراسرار ناول کا گمان ہوتا ہے۔ جو اپنی دلچسپ تفصیلات اور طرز تحریر کی وجہ سے فوراً ہی پڑھنے والے کو اپنے اندر محو کر لیتا ہے۔ یہ ایسا ناول ہے

جس کی کہانی میں بہت سے اتار چڑھاؤ آتے ہیں۔ آغاز میں قاری کو اس کے مرکزی کردار محمد علی جناح سے متعارف کروایا جاتا ہے۔ اس کے بعد قاری، جناح کی ۱۹۳۰ء کے بعد کی سیاسی زندگی اور جدوجہد میں اپنے آپ کو جذب ہوتا محسوس کرنے لگتا ہے۔ جناح اور ان کے سیاسی کام کے مختصر تعارف کے بعد ہم اپنے آپ کو ۱۹۳۵ء کے ایکٹ کے بعد کی قومی جدوجہد کے پرشور دور میں پاتے ہیں۔ برطانوی ہند کے صوبوں کے لیے اس ایکٹ کی اہمیت و افادیت پر روشنی ڈالنے کے بعد مصنفہ یہ واضح کرتی ہیں کہ کس طرح برطانیہ نے بڑی ہوشیاری کے ساتھ صوبائی خودمختاری کے پردے میں اپنے اقتدار کے دوام کو یقینی بنانے کا سامان کیا۔ وہ لکھتی ہیں کہ، "صوبائی خودمختاری کے احساس کو تقویت پہنچا کر اور مرکز پر برطانوی اختیار کو مضبوط تر بنا کر انگریز نے جس حکمت عملی کا مظاہرہ کیا وہ ہندوستان سے نکلنے کی نہیں بلکہ ہندوستان میں قیام کی حکمت عملی تھی۔" وہ مزید لکھتی ہیں۔ "۱۹۳۵ء کے ایکٹ نے ایک ایسا آہنی خول فراہم کیا جو ہندوستان میں برطانوی اقتدار کو بچانے کے مقصد سے وجود میں آیا تھا۔" ۱۹۳۵ء کے ایکٹ کے نتیجے میں ۱۹۳۷ء میں جو انتخابات منعقد ہوئے ان کے نتائج عائشہ جلال کو جناح کی صلاحیتوں کو زیر بحث لانے کا موقع فراہم کرتے ہیں اور یوں مصنفہ کا، اس شخصیت کے بارے میں تجزیہ ہمارے سامنے آتا ہے جس نے پاکستان کی تشکیل کی۔ مذکورہ انتخابات میں مسلم لیگ کی کارکردگی نہایت مایوس کن رہی اور مسلم اکثریتی علاقوں میں اسے رائے دہندگان نے یکسر مسترد کر دیا۔ پنجاب میں مسلمانوں کے لیے مخصوص ۸۷ میں سے صرف ایک سیٹ مسلم لیگ کے حصے میں آئی۔ سندھ کی ۳۶ مسلم سیٹوں میں سے لیگ ایک سیٹ بھی حاصل نہ کر سکی۔ صوبہ سرحد میں بھی ۳۶ مسلم سیٹوں میں سے مسلم لیگ کسی بھی سیٹ پر کامیابی حاصل نہ کر سکی۔ بنگال میں مسلم لیگ کو ۱۱۹ مسلم سیٹوں میں سے صرف ۳۷ پر کامیابی حاصل ہوئی۔ مسلم لیگ کی اس مایوس کن کارکردگی کے حوالے سے مصنفہ یہ رائے ظاہر کرتی ہیں کہ "جناح کے علاوہ اگر کوئی اور ہوتا تو وہ میدان چھوڑ کر بھاگ کھڑا ہوتا۔ لیکن جناح لمبی لڑائی لڑنے والے انسان تھے۔ وہ ایک طویل مگر آہستہ کھیل کے ماہر تھے۔ ان کی حیثیت ایک ایسے کھلاڑی کی تھی جو بدترین حالات میں بھی امکانات کی تلاش کے ماہر ہوتے ہیں" (صفحہ ۳۳) مصنفہ کا خیال ہے کہ جناح حکمت سازی کی بہترین صلاحیت رکھتے تھے۔ ان کی کتاب کے دو بنیادی خیالات میں سے ایک خیال یہی ہے۔

رچرڈ آٹن برا کی مشہور زمانہ فلم گاندھی میں جناح کی جو تصویر پیش کی گئی ہے اس کے حوالے سے سلمان رشدی نے جناح کے کردار کو ایک ڈریکولائی کردار قرار دیا ہے۔ اس کے برعکس عائشہ جلال کے یہاں جناح، خون چوس لینے والے کسی بھیانک کردار کے بجائے ایک ہوشیار، با تدبیر اور حکمت عملی مرتب کرنے کی غیر معمولی صلاحیتیں رکھنے والے انسان کی حیثیت سے سامنے

آتے ہیں۔ وہ ایک مشاق سیاستدان ہیں جو صحیح لمحے کے انتظار میں رہتے ہیں اور جب یہ لمحہ آجاتا ہے تو بڑے اطمینان کے ساتھ اپنا محتاط قدم اٹھا دیتے ہیں۔ مصنفہ جناح کے ہمعصروں اور ان تاریخ دانوں سے اتفاق کرتی ہیں جنہوں نے عموماً جناح کو ایک ایسا کھلاڑی قرار دیا جو تاش کے کھیل میں اپنے پتے سینے سے لگا کر رکھتا ہے۔ "ایک اچھا کھلاڑی جس کے پاس برے پتے ہوں، تاثر یہی دیتا ہے کہ اس کے پاس برے پتے نہیں ہیں، لہٰذا ہمیں جناح کے غیر واضح رویوں پر حیران نہیں ہونا چاہیے اور نہ ہی اس بات پر کہ حتمی نتیجہ اس سے بہت مختلف رہا جس کے لیے بظاہر بہت محنت کی گئی تھی اور ایک طویل جدوجہد کی گئی تھی۔" پھر ستمبر ۱۹۴۶ء میں ویول کے ساتھ ہونے والے مذاکرات کے حوالے سے عائشہ جلال کہتی ہیں کہ یہ جناح کی زبردست استقامت ہی کا مظہر ہے کہ زبردست سیاسی نقصانات، سخت نامساعدات اور شدید کھینچا تانی کے ماحول میں، جہاں کمتر درجہ کے لوگ بہت جلد ہار مان جاتے، جناح نے لڑائی جاری رکھنے کی غیر معمولی صلاحیت کا مظاہرہ کیا۔ مصنفہ کے خیال میں جناح کا یہی صبر و استقامت اور تدبر قیام پاکستان کا ایک اہم سبب تھا۔

زیر تبصرہ کتاب میں جو دوسرا اہم نظریہ پیش کیا گیا ہے اور جو پاکستان کے ان بہت سے لوگوں کے لیے جو برسوں سے تاریخ کے بارے میں سرکاری نقطۂ نظر ہی سنتے چلے آرہے ہیں، ایک انکشاف کی حیثیت رکھے گا، یہ ہے کہ جناح کے پیش نظر جو پاکستان تھا وہ ہندوستان کی تقسیم کے نتیجے میں معرض وجود میں لانا مطلوب نہیں تھا۔ درحقیقت سب سے زیادہ انکشاف انگیز بات جو عائشہ جلال کہتی ہیں وہ یہ ہے کہ پاکستان کی اصطلاح کو نہ تو مسلم لیگی لیڈروں نے اور نہ ہی جناح نے کبھی واضح کیا" پاکستان" ۱۹۳۰ء اور ۱۹۴۰ء کے عشروں (یہاں تک کہ ۱۹۴۷ء تک) میں "مسلمانوں کی مملکت" کے تجریدی تصور سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتا تھا جس کی سرحدیں اور آئینی حیثیت عموماً مبہم اور تضادات سے پر رہیں۔

اپریل ۱۹۴۰ء میں قرارداد لاہور کی منظوری کے بعد ایک پرانے مسلم لیگی آئی آئی چندریگر نے کہا: "قرارداد لاہور کا مقصد کوئی "السٹر" (ULSTER) قائم کرنا نہیں ہے بلکہ متحدہ ہندوستان کے اندر برابری کی بنیاد پر دو قوموں کا حصول ہے۔ قرارداد کا مقصد اکثریت کی حکمرانی کا متبادل تلاش کرنا تھا نہ کہ ہندوستان کے اتحاد کی تباہی"۔(صفحہ ۷۱ - ۷۰) ایچ وی ھاڈسن جو کہ حکومت برطانیہ کے کمشنر برائے اصلاحات تھے، ۱۹۴۱ء کے اواخر میں انڈیا تشریف لائے۔ انہوں نے بعد ازاں اپنی رپورٹ میں یہ نتیجہ اخذ کیا کہ، "بیشتر مسلمان جن کے ساتھ انہوں نے بات چیت کی اور جن میں پاکستان کے سخت گیر حامی بشمول جناح کے، شامل تھے۔ یہ سوچ رہے تھے کہ انگریز ہندوستان میں موجود رہیں گے ...... ہر مسلم لیگی نے پاکستان کی تعبیر، ہندوستان کے ایک

کنفیڈریشن کے حصے کی حیثیت سے کی جو مشترکہ دفاع کے مقصد سے وجود میں آتی بشرطیکہ مسلمانوں اور ہندوؤں کو برابری کا درجہ فراہم کر دیا جاتا۔" (صفحہ ۷۰)

اگست ۱۹۴۴ء میں جناح نے لاہور میں نوائے وقت کو ایک بیان دیتے ہوئے جس موقف کا اظہار کیا اس کا خلاصہ مصنفہ یوں بیان کرتی ہیں۔ "جناح کا پاکستان تقسیم ہند کا پیامبر نہیں تھا بلکہ اس کا مقصد انڈیا کو ایک ایسی یونین بنانا تھا جس میں پاکستان اور ہندوستان دونوں یکجا ہوتے اور بیرونی دنیا کے مقابلے میں سر اونچا کر کے کھڑے ہونے کی اہلیت رکھتے۔ یہ پین اسلامزم کا پیغام نہیں تھا۔ نہ ہی یہ ہندوستان کے خلاف مسلم ہند کی یکجائی تھی بلکہ ایک ایسے سیاسی نظام کا سیکولر تصور تھا جس میں مسلمانوں کے لیے حقیقی امکانات اور تحفظات میسر ہوتے۔ یہ جناح کے خوابوں کا ہندوستان تھا۔" (صفحہ ۱۲۲) پنجاب کے کہنہ مشق سیاستدان میاں ممتاز دولتانہ نے ۱۹۴۶ء کے واقعات کو یاد کرتے ہوئے جناح کے بیان کی تائید کی اور کہا: "جناح کبھی بھی ایک ایسا پاکستان نہیں چاہتے تھے جو تقسیم ہند پر منتج ہوتا۔ وہ کیبنٹ مشن کی سفارشات کو قبول کرنے کے حق میں تھے۔" (صفحہ ۲۰۲) حالانکہ پاکستان کا مطالبہ ۱۹۳۰ کے عشرے میں کیا گیا لیکن جون ۱۹۴۶ء میں بمبئی میں منعقدہ آل انڈیا مسلم لیگ کونسل سیشن میں بھی بقول مصنفہ، جناح "مطالبۂ پاکستان کی دو ٹوک الفاظ میں تعریف نہیں کر سکے۔" (صفحہ ۲۱۱)۔ یہی نہیں بلکہ مسلم لیگ سے وابستہ ایک پرانے بنگالی لیڈر ناظم الدین فروری ۱۹۴۷ء میں یعنی قیام پاکستان سے چند ہی ماہ قبل جبکہ مسلمانوں کی مملکت کے بارے میں سمجھوتے کے آثار تقریباً واضح ہو چکے تھے، "یہ نہیں جانتے تھے کہ پاکستان کا مطلب کیا ہے، حقیقت یہ ہے کہ مسلم لیگ میں کوئی بھی یہ بات نہیں جانتا تھا" (صفحہ ۲۳۸)۔ اگست ۱۹۴۷ء سے تین ماہ قبل یعنی مئی میں ماؤنٹ بیٹن، کانگریس اور جناح کے مابین ہونے والے مذاکرات کے حوالے سے مصنفہ یہ رائے ظاہر کرتی ہیں کہ "یہ کانگریس تھی جس نے تقسیم پر اصرار کیا اور یہ جناح تھے جو تقسیم کے مخالف تھے۔" عائشہ جلال کی یہ تحقیق ان لوگوں کی آنکھیں کھولنے کے لیے بہت کارآمد ہو سکتی ہے جنہیں پاکستان کے سرکاری تاریخ نویسوں نے اپنے مذموم مقاصد کے لیئے ایک مسخ شدہ تاریخ کے ذریعہ برین واش کر دیا ہے۔ جناح اور ان کے رفقاء کے یہاں جس ابہام کی نشاندہی عائشہ جلال نے کی ہے وہ ملک کے سرکاری ترجمانوں کے نقطۂ نظر کو بالکل رد کر دیتا ہے جو ہندوستان کے مسلمانوں کے لیے ایک علیحدہ آزاد مملکت کو ۱۹ویں صدی میں سر سید احمد خاں اور ۱۹۳۰ء کے عشرہ کے اوائل میں اقبال کا مطمع نظر قرار دیتے ہیں۔ یقیناً بعض صوبوں میں ہندوؤں کے تسلط کے خلاف مسلمانوں کے طبقۂ اشرافیہ میں بے چینی موجود تھی مگر عائشہ جلال نے بڑی گہرائی میں جا کر یہ ثابت کیا ہے کہ دراصل یہ مسلم اکثریتی صوبے ہی تھے جو پاکستان کے تصور سے الرجک تھے۔

پنجاب، بنگال، سندھ اور سرحد کے صوبے ہی تھے جو تصور پاکستان سے سب سے زیادہ دور تھے۔ "پاکستان" درحقیقت مسلم اقلیتی صوبوں کے ایک محدود سے طبقۂ اشرافیہ کی ضرورت تھا۔ لیگ ۱۹۳۷ء کے انتخابات میں عبرتناک شکست سے دوچار ہوئی تھی اور اگرچہ ۱۹۴۵ء کے الیکشن میں اس نے کامیابیاں حاصل کی تھیں مگر عائشہ جلال کے خیال میں اپریل ۱۹۴۶ء تک مسلم اکثریتی صوبوں میں "پاکستان" کے تصور کو کوئی حمایت حاصل نہیں ہوئی تھی۔ سندھ اور سرحد اپنی آزادی کے خواہشمند تھے، ناکہ پاکستان کے، "صوبہ سرحد میں مشن (کیبنٹ مشن) کو کانگریسی وزیر اعلیٰ ڈاکٹر خان صاحب نے دو ٹوک الفاظ میں بتا دیا تھا کہ لیگ مسلمانوں کی نمائندگی نہیں کرتی۔ پختونوں کو اپنے پنجابی ہمسایوں سے کوئی الفت نہیں رہی۔ ... کبھی بخوشی پاکستان میں شامل نہیں ہوں گے۔ وہ کسی مرکزی حکومت کے خواہش مند نہیں تھے۔ مگر انہیں ہندو مرکز کے تسلط کا خوف بھی نہیں تھا۔ ان کے لئے بہترین راستہ ان کی آزادی تھی۔" (صفحہ ۱۸۱)۔ پنجاب، صوبائی خودمختاری، ریاستوں کی خود مختاری اور کمزور مرکز کا آرزومند تھا۔ "سندھ کے وزیر اعلیٰ غلام حسین کا کہنا تھا کہ "بہتر ہوا گر ہندستان کی سیاست کو صوبوں سے دور رکھا جائے، خاص طور سے سندھ سے۔" (صفحہ ۱۸۰) ان کا خیال تھا کہ "بیرونی عناصر کو خواہ ... کسی بھی عقیدے کے حامل ہوں، چاہیے کے وہ سندھ کو اس کے حال پر چھوڑدیں۔" (صفحہ ۱۸۰)۔ بنگالی قیادت نے اپنے صوبے کی ممکنہ تقسیم کے خطرے کے پیش نظر واضح طور پر کہہ دیا تھا کہ بنگال، بنگالی ہے، مسلمان نہیں۔" (صفحہ ۱۸۰)۔ یہ حقائق دو قومی نظریے کے معذرت خواہوں کی افسانہ طرازیوں کو بے معنی ثابت کر دیتے ہیں۔

چونکہ مسلم لیگ، مسلمان اقلیتی صوبوں کی اشرافیہ کے مقاصد اور مفادات کی نمائندگی کرتی تھی لہذا اس کا سماجی پروگرام اور فلسفہ بھی انہی کا پرتو تھا۔ اکتوبر ۱۹۳۷ء میں علامہ اقبال

"کو یقین کو ہوچکا تھا کہ لیگ کو اب اس بات کا فیصلہ کرنا ہوگا کہ آیا وہ ہندوستانی مسلمانوں کے اعلیٰ طبقات کی نمائندگی کرے گی یا مسلمان عوام کی جنہوں نے اس وقت تک لیگ میں کسی دلچسپی کا مظاہرہ نہیں کیا تھا۔ اصل مسئلہ، جیسا کہ اقبال کا خیال تھا، یہ تھا کہ "مسلمانوں کی غربت کے مسئلہ سے کیوں کر عہدہ برا ہوا جائے؟ .... مسلمانوں کے روٹی کے مسئلے کو حل کرنے کا واحد راستہ "قانون اسلام" کے نفاذ کو گردانا گیا۔ "قانون اسلام" کی بنیاد پر ایک جرات مندانہ سماجی و اقتصادی نظام ہی، بقول اقبال، حالات کا پانسہ پلٹ سکتا تھا۔ مگر یہ "قانون" تھا کیا اور کیونکر روبہ عمل آسکتا تھا، اس کی وضاحت نہیں کی گئی۔ بہرحال جناح اس قدر زیرک اور سیکولر تھے کہ اس سراب کا پیچھا کر سکتے تھے۔ اگر قانون اسلام کی توجیہہ علماء سے کروائی جاتی جو اس قانون

کے روایتی علمبردار تھے، تو جناح کے اپنے کرنے کے لیے کچھ نہیں بچتا...... پھر جناح دیکھ سکتے تھے کہ مذہب یا کسی انقلابی اقتصادی پروگرام کے حوالے سے لوگوں کو اپیل کرنے سے خود اس کے علمبردار بھاگ کھڑے ہوں گے۔ لیگ کسی ایسے پروگرام کا خاکہ بھی نہیں بنا سکتی تھی جس کا مقصد مسلمانوں کی غربت کو دور کرنا ہوتا کیونکہ اس کو جو حمایت حاصل تھی وہ زمینداروں، سرمایہ داروں اور دیگر مفاد یافتہ طبقات کی حمایت تھی۔ بہرصورت ایسی اپیل جناح کے مقاصد کے لیے غیر موزوں ثابت ہوتی۔" (صفحہ ۴۳-۴۲)

اکتوبر ۱۹۴۴ء میں عبدالستار نیازی نے (جو کہ پنجاب میں لیگ کے سینئر رکن تھے) لاہور میں ایک اجلاس طلب کیا تاکہ پاکستان کو ایک اسلامی ریاست کے طور پر قائم کرنے کے موضوع پر گفتگو کی جا سکے۔ سول اینڈ ملٹری گزٹ نے اسے "جناح اور لیگ کے خلاف بغاوت قرار دیا" اس سے قبل اپریل ۱۹۴۳ء میں لیگ کے دہلی اجلاس میں "ایک قرارداد جناح کے کہنے پر خاموشی کے ساتھ واپس لے لی گئی جس میں کہا گیا تھا کہ پاکستان کے مستقبل کا دستور اسلامی قانون پر استوار ہوگا۔" (صفحہ ۹۶) اس انکشاف سے عائشہ جلال پاکستان کے ذرائع ابلاغ کے ایک اور پروپیگنڈے کو دریا برد کر دیتی ہیں۔

زیر تبصرہ کتاب میں اور بھی ایسے خیال انگیز نکات موجود ہیں جو اس کتاب کی افادیت کو دوچند کر دیتے ہیں۔ مثلاً اس میں ماؤنٹ بیٹن کے اس جانبدارانہ طرز عمل کو بھی بے نقاب کیا گیا ہے جس کا انہوں نے تقسیم کے آخری مراحل کے موقع پر مظاہرہ کیا تھا۔ ماؤنٹ بیٹن نے مختلف مواقع پر جناح کو فاتر العقل، نفسیاتی مریض وغیرہ کے القاب دے دیئے تھے۔ اس پس منظر میں یہ بات حیرت انگیز معلوم نہیں ہوتی کہ آخری فیصلہ کن دنوں میں ماؤنٹ بیٹن نے وقتاً فوقتاً نہرو کو اعتماد میں لینے کا مظاہرہ کیا۔ جیسا کہ عائشہ جلال بتکرار کہتی ہیں کہ، "ماؤنٹ بیٹن نے پروٹوکول اور غیر جانبداری کو بالکل اہمیت نہیں دی۔ یہ بات طے پائی تھی کہ تقسیم کا پلان تمام سیاسی رہنماؤں کو ایک ساتھ دکھایا جائے گا۔ مگر یہ ماؤنٹ بیٹن کا جناح کو ناپسند کرنا ہی تھا جس کی وجہ سے نہرو اور کانگریس کو تقسیم ہند کے حوالے سے شک کا فائدہ پہنچایا گیا۔

عائشہ جلال نے مسلم اکثریتی صوبوں کی سیاسی حرکیات کا بھی بڑی تفصیل کے ساتھ احاطہ کیا ہے اور جناح اور لیگ کے مرکزی اداروں کے ساتھ ان کے تعلقات کا بھی تجزیہ کیا گیا ہے۔ مقامی سیاست کا ان کا مطالعہ قابل رشک ہے۔ پنجاب، جو بعد ازاں پاکستان کا سب سے بااثر اور طاقتور صوبہ بنا، کے حوالے سے ان کا تجزیہ بہت دلچسپ ہے۔ جگہ جگہ وہ پنجاب کی "روایتی موقع پرستی" کا تذکرہ کرتی ہیں اور اس رائے کا اظہار کرتی ہیں کہ کس طرح پنجاب کے لیڈر بڑی بولی لگانے والے کا ساتھ دینے پر آمادہ ہو جاتے ہیں۔ "ماضی میں اس رجحان کا رنجیت سنگھ کے دور تک

سراغ لگایا جاسکتا ہے، جو اپنے پنجاب سے خوب واقف تھا۔ اس دور میں بھی صوبے کے بڑے خاندان ملک میں مرکزی سطح پر آنے والی تبدیلیوں سے متاثر ہونے سے صرف اپنی وابستگی بدل کر بچ جاتے تھے۔ پنجاب کی یہ پرانی روایت آج تک زندہ ہے۔ جب یونینسٹ ان کے مقامی مفادات کی تکمیل کے اہل نہیں رہے تو زمینداروں اور پیروں کو نئے سرپرستوں کے ساتھ رشتۂ وفاداری استوار کر لینے میں دیر نہیں لگی۔" (صفحہ ۱۴۴-۱۴۳)۔

یہاں ہم عائشہ جلال کی کتاب پر چند تنقیدی نکات بھی پیش کرنا چاہتے ہیں۔ پہلا مسئلہ تو یہی ہے کہ آخر نظریہ کیا چیز ہے اور تاریخ کیا ہے، کیا تاریخ، چند درجن باکمال اور مذاکرات کے ماہر سیاستدانوں ہی کے ہاتھوں بنتی ہے؟ یا یہ کہ عوام اور پیداواری قوتیں تاریخ کی معمار ہوتی ہیں؟ صاف ظاہر ہے کیمبرج کی تاریخ کے مدرسہ فکر کا رجحان اول الذکر ہی کی طرف ہے اور اس سے ہم اتفاق نہیں کرتے۔ تاہم اگر بورژوا فکر کے دائرے میں رکھ کر دیکھا جائے تو یہ یقیناً ایک زبردست کتاب قرار پائے گی۔ پھر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ جناح نے سارا کھیل (مصنفہ کی کھیل کی تمثیل کی رعایت سے) کیوں کھیلا؟ وہ اتنے یکسو کیوں تھے؟ اپنے ارادے میں اس قدر اٹل کیوں تھے؟ وہ آخر پاکستان کیوں چاہتے تھے؟ کس کے لیے چاہتے تھے؟ کیا یہ اقتدار کا کھیل تھا یا محض ذہنی اور سیاسی چیلنج؟ ان سوالات کا جواب اس کتاب میں نہیں مل پاتا۔ ہماری تیسری تنقید یہ ہے کہ ہمارے خیال میں عائشہ جلال کی تاریخ کی تعبیر میں ایک بڑا تضاد پوشیدہ ہے وہ جناح کو ایک ایسے ذہین، زیرک اور مذاکرات کے بادشاہ کے طور پر پیش کرتی ہیں جو بالعموم اپنے حریفوں کو نیچا دکھاتا ہے۔ مگر ماؤنٹ بیٹن کے ساتھ جو آخری معاملہ ہوا وہ خود بقول عائشہ جلال، جناح کی شکست تھا۔ ماؤنٹ بیٹن نے انتہائی سختی اور کسی قدر بے عزتی کے انداز میں جناح کو مجبور کیا کہ وہ کٹا پٹا پاکستان قبول کرنے پر آمادہ ہو جائیں۔ تو سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا بالآخر وہ کامیاب ٹھہرے۔

ان اعتراضات کے باوجود ہم سمجھتے ہیں کہ عائشہ جلال نے اس کتاب کے ذریعہ اپنے آپ کو پاکستان کے صف اول کے تاریخ دانوں میں شامل کروا لیا ہے۔ انہوں نے ملک کے ان تاریخ نویسوں کے لیے یقیناً دائرہ تنگ کر دیا ہے جو تاریخ کے نام پر خرافات لکھتے رہے ہیں۔ اور بدقسمتی سے انہیں سرکاری سرپرستی بھی حاصل رہی ہے۔ عائشہ جلال کی ایک خوبی یہ بھی ہے کہ انہیں زبان پر زبردست قدرت حاصل ہے۔ اپنے مضمون اور زبان پر بیک وقت دسترس کا حامل ہونا ایک نایاب چیز ہے۔ عائشہ جلال کی تاریخ نویسی کے معیار اور تحریر کی صلاحیتوں کے پس منظر میں ان سے مزید توقعات وابستہ کی جاسکتی ہیں اور ہمیں ان کی مزید تحقیقی کاوشوں کا منتظر رہنا چاہیئے۔

اکبر زیدی

پاکستان اور سوویت یونین کے تعلقات کا ایک معروضی جائزہ۔

تصنیف:

Pakistan's Relations with the Soviet Union, 1947-1979; Constraints and Compulsions.

مصنف: محبوب اے پوپاٹیا
پبلشر: پاکستان اسٹڈی سینٹر، جامعہ کراچی۔
قیمت: ۸۵ روپے۔

حصول آزادی کے بعد ہی سے پاکستان، ہندوستان کے بالمقابل ایک طرح کے احساس کمتری کا شکار رہا ہے۔ "جو ہندوستان کے لیے اچھا ہے وہ پاکستان کے لیے برا ہے اور جو ہندوستان کے لیے برا ہے وہ پاکستان کے لیے اچھا ہے" اور "ہندوستان کا دوست پاکستان کا دشمن ہے۔" یہ وہ چند اصول ہیں جو پاکستان کی خارجہ پالیسی اور پالیسی سازوں کی رہنمائی کرتے رہے ہیں۔ بالخصوص آزادی کے بعد کے برسوں میں یہ رجحان آج کے مقابلے میں زیادہ تھا۔ ہندوستان مخالف اور مغرب نوازی کے پاکستانی حکمران طبقے کے اس رجحان نے ہماری خارجہ پالیسی کا تعین کیا۔ یہ حقیقت کہ یہ پالیسی تھوڑی بہت تبدیلیوں کے ساتھ آج بھی زیر عمل ہے محبوب پوپاٹیا کی فکر کشا کتاب میں بڑی صراحت کے ساتھ سامنے آتی ہے۔

غیر ترقی یافتہ ممالک کم ہی غیر جانبدار ہوتے ہیں اور بقا کے تقاضے ان ملکوں کو کسی نہ

کسی کی حمایت پر مجبور کرتے ہیں۔ داخلی طبقاتی سمجھوتے اور مقامی حکمران طبقات کی ساخت اور ان کا دباؤ، خارجہ پالیسی کی نوعیت اور سمت کا تعین کرتے ہیں۔ ایسے ممالک بہت کم دیکھنے میں آتے ہیں جنہوں نے عالمی طاقتوں کے درمیان پل صراط کو کامیابی کے ساتھ طے کیا ہو اور ان سے اپنے تعلقات کو متوازی رکھتے ہوئے زیادہ سے زیادہ فوائد کے حصول میں کامیابی حاصل کی ہو۔ بالعموم ایسا ہوتا ہے کہ ایک مرتبہ کسی عالمی طاقت کی حلقہ بگوشی اختیار کرلی جائے تو پھر آئندہ کے تعلقات اسی نہج پر چلتے جاتے ہیں اور ایسا بہت کم ہوتا ہے کہ کوئی ملک کوئی ایسا بڑا انحرافی قدم اٹھائے جیسا کہ مصر میں انور السادات نے اٹھایا تھا۔ ہندوستان اور پاکستان باہمی کشیدگی کے مشترکہ ورثہ کے حامل ہیں، اور یہ حقیقت کہ دونوں دو مختلف عالمی طاقتوں کے حلیف ہیں ایک فطری امر ہے۔ وابستگیوں کا یہ تضاد وقت گذرنے کے ساتھ ساتھ پختہ ہوتا گیا ہے۔ پوپاٹیا کی یہ کتاب اسی تضاد کی وضاحت کرتی ہے اور آزادی کے بعد پاکستان کی خارجہ پالیسی کا سیر حاصل جائزہ پیش کرتی ہے۔ اس کتاب میں مصنف زار شاہی روس اور برطانوی ہند کے تعلقات سے بحث کا آغاز کرتے ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ ان تعلقات کا تعین عموماً خود یورپ میں ہونے والے واقعات سے ہوتا تھا۔ ۱۹۱۷ء کے انقلاب روس کے بعد سوویت یونین کی خارجہ پالیسی میں جو تبدیلی واقع ہوئی اس کا جائزہ، انقلاب روس کے رہنما لینن کے افکار کے حوالے سے لیا گیا ہے مصنف استعماری سوال نیز سوویت ریاست کے ہندوستانی کمیونسٹ اور استعمار مخالف تحریکوں کے ساتھ تعلقات کے موضوعات پر لینن کے نظریات کا حوالہ دیتے ہیں اور اس دور کا مختصر مگر ایک اچھا تجزیہ پیش کرتے ہیں۔

۱۹۴۷ء کے بعد پاکستان کے بیرونی دنیا کے ساتھ تعلقات جغرافیائی و سیاسی تقاضوں اور ملک کے برسر اقتدار طبقات کی ضروریات اور خواہشات سے متعین ہوئے۔ پوپاٹیا، آزادی کے وقت پاکستان کے طبقاتی ڈھانچے کا درست تجزیہ کرتے ہیں۔ وہ ان طبقات کی نشاندہی کرتے ہیں۔ جنہیں آزادی کے نتیجے میں سب سے زیادہ فوائد پہنچے۔ سوویت یونین اور امریکہ کے ساتھ ملک کے تعلقات کی نوعیت کو سمجھنے کے لیے مذکورہ طبقات کے طرز فکر اور مفادات سے صرف نظر نہیں کیا جاسکتا۔ مصنف نے یہ کام بڑی خوش اسلوبی سے سرانجام دیا ہے۔

مصنف خاصی تفصیل سے اس امر کا بھی جائزہ لیتے ہیں کہ کس طرح روس کے ساتھ پاکستان کے تعلقات مسلسل خراب رہے ہیں ماسوائے چند مختصر ادوار کے۔ روس اور پاکستان کے درمیان سرد مہری کے طویل برسوں میں اگر تبدیلی کے کچھ آثار کبھی کبھار نمودار بھی ہوئے تو صرف ان مواقع پر جب روس اور امریکہ، امریکہ روس اور بھارت یا چین روس تعلقات میں کچھ تبدیلیاں واقع

ہوئیں۔ خوشگواری کے ان چند ایک مختصر دورانیوں کے علی الرغم بحیثیت مجموعی ہمارے روس کے ساتھ تعلقات برے ہی رہے ہیں۔ پاکستان کا روس کی طرف رویہ بعض ایسے مواقع پر بھی تبدیلی کے کچھ آثار کا حامل رہا ہے جب پاکستان امریکہ کے رویے پر شاکی رہا ہو یا امریکہ سے وابستہ اس کی توقعات پوری نہ ہوئی ہوں۔ مثال کے طور پر پاکستان اور ہندوستان کے درمیان دونوں جنگوں کے بعد جب امریکہ نے پاکستان کی اقتصادی و فوجی امداد پر پابندی عائد کی تو ہماری خارجہ پالیسی کے اسٹیبلشمنٹ نے سوویت یونین کی طرف اپنے رویے میں کسی قدر تبدیلی کا عندیہ دیا۔ "سوشلزم" اور "غیر جانبداری" کے ساتھ بھٹو کے ہنی مون نے پاکستان کو روس کے ساتھ تجارت اور روسی امداد کے حصول میں سہولت پہنچائی جس کے نتیجے میں ۱۹۷۰ء کے عشرے میں روسی تعاون سے پاکستان میں ملک کی واحد اسٹیل مل قائم ہوئی۔

زیر تبصرہ کتاب ایک ایسے تاریخی موڑ پر آن کر ختم ہو جاتی ہے جو سب سے زیادہ دلچسپ ہو سکتا تھا یعنی افغانستان میں روسی فوج کی مداخلت، اس واقعہ نے دونوں عالمی طاقتوں کے تعلقات کو اتھل پتھل کر کے رکھ دیا اور پاکستانی سرحد پر "سرخ خطرے" نے آئندہ عشرے میں پاکستان کی داخلی اور خارجہ پالیسی پر غیر معمولی اثرات مرتب کیے۔ ۱۹۷۹ء کے بعد کا دور صرف افغان جنگ کی وجہ ہی سے اہم نہیں ہے بلکہ اس دور کی اہمیت کا ایک سبب یہ بھی ہے کہ اسی زمانے میں خود روس میں پیریسٹرائیکا کے نتیجے میں بڑے پیمانے پر طرز فکر کی اور عملی تبدیلیاں واقع ہوئی ہیں۔ بیرونی دنیا کے ساتھ بھی روس کے تعلقات کا ایک نیا باب کھل گیا ہے۔ ایک تازہ تر اور پاکستان کے نقطۂ نظر سے انتہائی اہم تبدیلی، افغانستان سے روسی افواج کا انخلا بھی ہے۔ چنانچہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ پاکستان اور روس کے تعلقات کے ضمن میں گذشتہ دس گیارہ سال جو مطالعہ اور تجزیے کے نقطۂ نظر سے سب سے زیادہ دلچسپ ہو سکتے تھے، مذکورہ کتاب میں جگہ نہیں پا سکے۔ اور قاری اس حوالے سے کتاب میں تشنگی پاتا ہے۔

بعض چھوٹی موٹی فروگذاشتوں کے باوجود یہ کتاب پاکستان اور روس کے تعلقات کا ایک معروضی تجزیہ پیش کرتی ہے۔ جہاں مصنف ناکام رہے ہیں وہ ۱۹۷۱ء میں بنگالی تحریک آزادی پر مشتمل باب ہے۔ ■ تحریک آزادی کی داخلی حرکیات کا تجزیہ نہیں کر پائے۔ اس موضوع پر وہ زیادہ تر بیرونی عوامل ہی کو زیر بحث لائے ہیں اور محض سوویت یونین اور انڈیا کے کردار ہی کے حوالے سے اس پورے واقعہ کی تشریح کرنے پر اکتفا کرتے ہیں۔ ■ بیرونی اور داخلی عوامل کے ارتباط پر خاطر خواہ روشنی نہیں ڈالتے۔ اسی طرح گو کہ افغان مسئلہ پر کافی تفصیلی بحث کی گئی ہے اور افغان انقلاب اور مابعد کی صورتحال پر مصنف ہمیں خاصی معلومات فراہم کرتے ہیں۔ مگر اس مسئلہ کے روس پاکستان تعلقات پر مرتب ہونے والے اثرات کا احاطہ نہیں کرتے۔

کتاب عمدہ معیار طباعت کی حامل ہے۔ کتابت کی غلطیاں بھی بہت کم ہیں۔ آخر میں کتابیات کی ایک مفصل اور کارآمد فہرست بھی دے دی گئی ہے تاکہ اگر کوئی اور محقق اس موضوع پر کام کرے تو حوالے کی خاصی چیزیں اس کے سامنے موجود ہوں۔ مصنف نے سوویت یونین، پاکستان اور دیگر ممالک میں چھپنے والے مواد کا بڑی عرق ریزی کے ساتھ مطالعہ کیا ہے۔ یہ کتاب جامعہ کراچی کے پاکستان اسٹڈی سینٹر نے شائع کی ہے جس سے محبوب پوپاٹیا منسلک ہیں۔ گذشتہ چند برسوں میں اس سینٹر نے بعض بہت اچھی تحقیقی کتابیں شائع کی ہیں اور یہ ادارہ اپنی علمی اور تحقیقی سرگرمیوں کے حوالے سے پاکستان کی علمی دنیا میں اپنے لیے ایک معتبر مقام بنا چکا ہے۔ مصنف اور مذکورہ ادارے کی یہ تحقیقی کاوش یقیناً قارئین کی توقعات پر پوری اترے گی۔

اکبر زیدی

ہمارے گزشتہ مجموعوں کے موضوعات

پاکستان کے مزدور طبقے کی تاریخ

ریاست اور طبقات

زرعی اصلاحات ۔ ایک جائزہ

صوبہ سرحد کا سماجی ڈھانچہ

عالمی اجارہ داریاں اور پاکستان

پاکستان کا نظام صحت

جدید پنجابی ادب ۔ ایک تاریخی جائزہ

عالمی مزدور تحریک

سندھ ہاری کمیٹی

پاکستان میں مزدور قوانین

پڙهندڙ نسُل . پَ نَ

The Reading Generation

1960 جي ڏهاڪي ۾ عبدالله حسين ” اُداس نسلين“ نالي ڪتاب لکيو. 70 واري ڏهاڪي ۾ وري ماڻِڪَ ”لُڙهندڙ نسُل“ نالي ڪتاب لکي پنهنجي دورَ جي عڪاسي ڪرڻ جي ڪوشش ڪئي. امداد حُسينيءَ وري 70 واري ڏهاڪي ۾ ئي لکيو:

انڌي ماءُ ڄڻيندي آهي اونڌا سونڌا ٻارَ
ايندڙ نسل سَمورو هوندو گونگا ٻوڙا ٻارَ

هر دور جي نوجوانن کي اُداس، لُڙهندڙ، ڪَڙهندڙ، ڪُڙهندڙ، ٻَرندڙ، چُرندڙ، ڪِرَندڙ، اوسيئڙو ڪَندڙُ، ياڙي، ڪاٺو، پاڄوڪَڙُ، ڪاوڙيل ۽ وِڙهندڙ نسلن سان منسوب ڪري سَگهجي ٿو، پَر اسان اِنهن سڀني وِچان ”پڙهندڙ“ نسل جا ڳولائو آهيون. ڪتابن کي ڪاڳر تان کڻي ڪمپيوٽر جي دنيا ۾ آڻڻ، ٻين لفظن ۾ برقي ڪتاب يعني e-books ناهي ورهائڻ جي وسيلي پڙهندڙ نسل کي وَڌڻ، ويجهَڻ ۽ هِڪَ ٻِئي کي ڳولي سَهڪاري تحريڪ جي رستي تي آڻِڻَ جي آسَ رکون ٿا.

پڙھندڙ نسل (پَنَ) ڪا بہ تنظيمَ ناھي. اُنَ جو ڪو بہ صدر، عُهديدار يا پايو وِجھندڙ نہ آھي. جيڪڏھن ڪو بہ شخص اھڙي دعوىٰ ڪري ٿو تہ پَڪَ ڄاڻو تہ اُھو ڪُوڙو آھي. نہ ئي وري پَنَ جي نالي ڪي پئسا گڏ ڪيا ويندا. جيڪڏھن ڪو اھڙي ڪوشش ڪري ٿو تہ پَڪَ ڄاڻو تہ اُھو بہِ ڪُوڙو آھي.

جَھڙيءَ طَرَح وڻن جا پَنَ ساوا، ڳاڙھا، نيرا، پيلا يا ناسي ھوندا آھن اَھڙيءَ طرح پڙھندڙ نَسُل وارا پَنَ بہ مختَلِف آھن ۽ ھوندا. اُھي ساڳِئي ئي وقت اُداس ۽ پڙھندڙ، ٻَرندڙ ۽ پڙھندڙ، سُست ۽ پڙھندڙ يا وِڙھندڙ ۽ پڙھندڙ بہ ٿي سگھن ٿا. ٻين لفظن ۾پَنَ ڪا خُصوصيِ ۽ تالي لڳل ڪِلَب Exclusive Club نہ آھي.

ڪوشش اھا ھوندي تہ پَنَ جا سڀ ڪَم ڪار سَھڪاري ۽ رَضاڪار بنيادن تي ٿين، پر ممڪن آھي تہ ڪي ڪم اُجرتي بنيادن تي بہ ٿِين. اھڙي حالت ۾ پَنَ پاڻ ھِڪَبِئي جي مدد ڪَرڻ جي اُصولَ ھيٺ ڏي وَٺُ ڪندا ۽ غيرتجارتي non-commercial رھندا. پَنَن پاران ڪتابن ڪي ڊجيٽائِيز digitize ڪرڻ جي عَملَ مان ڪو بہ مالي فائدو يا نفعو حاصل ڪرڻ جي ڪوشش نہ ڪئي ويندي.

ڪتابن ڪي ڊجيٽائِيز ڪرڻ ڪان پو ٻيو اھم مرحلو وِرھائڻ distribution جو ٿيندو. اِھو ڪم ڪرڻ وارن مان جيڪڏھن ڪو پيسا ڪمائي سگھي ٿو تہ ڀلي ڪمائي، رُڳو پَنَن سان اُن جو ڪو بہ لاڳاپو نہ ھوندو.

پَنَن کي کُليل اکرن ۾ صلاح ڏجي ٿي تہ هو وَسَ پٽاندڙ وڌِ
کان وَڌِ ڪتاب خريد ڪَري ڪتابن جي ليکڪَن، ڇپائيندڙن ۽
ڇاپيندڙن کي هِمٿائِن. پر ساڳئي وقت عِلم حاصل ڪرڻ ۽ ڄاڻ
کي ڦهلائڻ جي ڪوشش دوران ڪَنهن بہ رُڪاوٽَ کي نہ مڃن.
شيخ اَيازَ علمَ، ڄاڻَ، سمجهہَ ۽ ڏاهپَ کي گيتَ، بيتَ، سِٽَ،
پُڪارَ سان تَشبيهہ ڏيندي انهن سيني کي بَمن، گولين ۽ بارودَ
جي مدِ مقابل بيهاريو آهي. اياز چوي ٿو تہ:
گيتَ بہِ ڄڻ گوريلا آهن، جي ويريءَ تي وار ڪَرن ٿا.
... ...
جئن جئن جاڙ وڌي ٿي جَڳَ ۾، هو بوليءَ جي آڙ ڇُپن ٿا:
ريتيءَ تي راتاها ڪن ٿا، موٽي مَنجهہِ پهاڙ ڇُپن ٿا:
... ...
ڪالهہَ هُيا جي سُرخ گُلن جيئن، اڄڪلهہ نيلا پيلا آهن:
گيتَ بہِ ڄڻ گوريلا آهن........
... ...
هي بيتُ اَٿي، هي بَم- گولو،
جيڪي بہ ڪٽين، جيڪي بہ ڪٽين!
مون لاءِ ٻنهي ۾ فَرَقُ نہ آ، هي بيتُ بہ بَمَ جو ساٿي آ،
جنهن رِڻَ ۾ رات ڪَيا راڙا، تنهن هَڏَ ۽ چَمَ جو ساٿي آ ـ
اِن حسابَ سان اٽڃاٽائي کي پاڻَ تي اِهو سوچي مَڙهڻ تہ
”هاڻي ويڙهہ ۽ عمل جو دور آهي، اُن ڪري پڙهڻ تي وقت نہ
وڃايو“ ناداني‌ءَ جي نشاني آهي.

پَڙَهن جو پڙهڻ عام ڪِتابي ڪيڙن وانگر رُڳو نِصابي ڪتابن تائين محدود نہ هوندو. رڳو نصابي ڪتابن ۾ پاڻ کي قيد ڪري ڇڏڻ سان سماج ۽ سماجي حالتن تان نظر ڪڇي ويندي ۽ نتيجي طور سماجي ۽ حڪومتي پاليسيون policies اڻڄاڻن ۽ نادانن جي هٿن ۾ رهنديون. پَڙهَ نِصابي ڪتابن سان گڏوگڏ ادبي، تاريخي، سياسي، سماجي، اقتصادي، سائنسي ۽ ٻين ڪتابن کي پڙهي سماجي حالتن کي بهتر بنائڻ جي ڪوشش ڪندا.

پڙهندڙ نَسُل جا پَڙهَ سيني کي **ڇو، ڇالاءِ ۽ ڪيئن** جهڙن سوالن کي هر بَيانَ تي لاڳو ڪرڻ جي ڪوشش ڏين ٿا ۽ انهن تي ويچار ڪرڻ سان گڏ جوابَ ڳولڻ کي نہ رڳو پنهنجو حق، پر فرض ۽ اٽل گهرج unavoidable necessity سمجهندي ڪتابن کي پاڻ پڙهڻ ۽ وڌ کان وڌ ماڻهن تائين پهچائڻ جي ڪوشش جديد ترين طريقن وسيلي ڪرڻ جو ويچار رکن ٿا.

توهان بہ پڙهڻ، پڙهائڻ ۽ ڦهلائڻ جي اِن سهڪاري تحريڪ ۾ شامل ٿي سگهو ٿا، بَس پنهنجي اوسي پاسي ۾ ڏِسو، هر قسم جا ڳاڙها توڙي نيرا، ساوا توڙي پيلا پن ضرور نظر اچي ويندا.

وڻ وڻ کي مون ياڪِي پائي چيو تہ "منهنجا ياءُ
پهتو منهنجي من ۾ تنهنجي پَنَ پَنَ جو پڙلاءُ".

- اياز (ڪلهي پاتم ڪينرو)